نورتن کہانیاں

شمیم احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد بخش مہجور کی کلاسیکی کتاب 'نورتن' کا انتخاب

نورتن کہانیاں

(بچّوں کے لیے)

انتخاب اور بازگوئی

شمیم احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کراتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچاتا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ اپنے بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

ایس۔ موہن

ڈائرکٹر انچارج

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

زخشاں، تمثیل اور عدنان کے نام

فہرست

دوسرا باب : فریادیوں اور عادلوں کی کہانیاں

تیسرا باب : بے وقوفوں کی کہانیاں

چوتھا باب : ظریفوں کی کہانیاں

دوسرا باب : فریادیوں اور عادلوں کی کہانیاں

تیسرا باب : بے وقوفوں کی کہانیاں

چوتھا باب : ظریفوں کی کہانیاں

پانچواں باب : افیونیوں کی کہانیاں

چھٹا باب : کنجوسوں کی کہانیاں

نورتن کا تعارف

"نورتن" اُردو کے قدیم ادب کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ اِس میں مختصر داستانیں شامل ہیں۔ محمد بخش مہجور نے یہ کتاب اب سے کوئی پونے دو سَو برس پہلے لکھی تھی۔ مہجور کے والد کا نام حکیم خیر اللہ تھا، جو رہنے والے تو تھے فتح پور ہسوا کے مگر بعد میں وہ لکھنؤ چلے آئے تھے اور وہیں مستقل طور پر رہ پڑے۔ لکھنؤ ہی میں محمد بخش مہجور پیدا ہوئے اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ والد کی طرح خود بھی طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ جوانی ہی میں شاعری کرنے لگے تھے۔ پہلے شیخ قلندر بخش جرأت اور بعد میں مرزا خانی نوازش کے شاگرد ہوئے۔ مہجور لکھنؤ میں نفی گنج میں رہتے تھے۔ حج کے لیے خانۂ کعبہ گئے اور مدینۂ منوّرہ میں انتقال کیا۔

ہمارے ادب میں "نورتن" کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1857 تک لکھنوی نثر کے سرمائے میں صرف تین کتابیں ہی اہم سمجھی جاتی تھیں۔ ایک تو یہی "نورتن" اور دوسری دو "فسانۂ عجائب" اور "بُستانِ حکمت"۔ "نورتن" اور "فسانۂ عجائب" کی ہمارے قدیم ادب میں اِس وجہ سے بھی بڑی اہمیت ہے کہ یہ دونوں کتابیں عموماً طبع زاد سمجھی جاتی ہیں۔ طبع زاد سے مُراد یہ ہے کہ ان کے قصّے کسی اور زبان سے ترجمہ نہیں کیے گئے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں شامل بعض

حکایات مختلف جگہوں سے لی گئی ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو بہت ہی قدیم زمانے سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں، اور بہت مشہور ہیں۔ تاہم ان کی اکثر حکایات ان کے مصنفین کی طبع زاد لکھی ہوئی ہیں۔ 'فسانۂ عجائب' کی حکایات تو ایک ہی مرکزی قصے سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ 'نورتن' کی تمام کہانیاں الگ الگ اور آزاد ہیں۔ اور ان کی ایک بڑی خوبی ان کا مختصر ہونا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'نورتن' ہمارے ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ 'نورتن'، 'فسانۂ عجائب' سے دس سال پہلے لکھی گئی۔

کتاب کا نام 'نورتن' رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مہجور نے اس کتاب میں نو باب قائم کیے ہیں اور ہر باب میں مختلف کہانیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ انتخاب چونکہ خاص بچّوں کے لیے تیار کیا گیا ہے، اس لیے اس میں وہ باب شامل نہیں کیے گئے جو بچّوں کے لیے نہ دلچسپ تھے اور نہ مناسب۔ ہم نے اس مجموعے میں صرف اُن کہانیوں کو شامل کیا ہے جو 'نورتن' میں تیسرے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، آٹھویں اور نویں باب میں شامل ہیں۔ کہانیوں کی اہمیت اور دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ابواب اور ان کی کہانیوں کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے۔

'نورتن' کی زبان قدیم لکھنوی زبان ہے، اور کافی اُلجھی ہوئی اور مشکل۔ ہم نے چونکہ اس کے قصّوں کو بچّوں کے لیے ترتیب دیا ہے اس لیے ان کی زبان بالکل تبدیل کر دی گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ ساری کہانیاں ایسی سہل اور عام فہم زبان میں بیان کی جائیں کہ انھیں بچّے بہ خوبی پڑھ اور سمجھ سکنے کے علاوہ ان سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہو سکیں۔ ان کہانیوں کو آسان زبان میں پھر سے لکھتے وقت یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان مصنّف کے اندازِ بیان سے ملتی ہوئی رہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض لفظ آپ کے لیے مشکل ہوں لیکن اگر ان کا مطلب بھی معلوم نہ ہو تو

بھی کہانی کے لطف میں کمی نہیں آتی اور بات بہرحال سمجھ میں آجاتی ہے۔

ان کہانیوں میں سے اکثر کہانیاں سبق آموز یا سبق سکھانے والی ہیں، لیکن اس کے باوجود مہجور کی قدم قدم پر یہ کوشش رہی ہے کہ قصّہ قصّے کی حیثیت سے بھی زیادہ سے زیادہ دلچسپ رہے۔ اُس زمانے کی داستان گوئی کی عام روش کے لحاظ سے یہ بہت بڑی بات تھی۔

'نورتن' میں شامل بیشتر کہانیاں مصنّف کی طبع زاد ہیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو دوسرے ذریعوں سے مصنّف تک پہنچیں۔ مثلاً اس انتخاب میں ایک کہانی اُن دو عورتوں پر مشتمل ہے جو ایک بچّے کے لیے جھگڑا کرتی ہیں اور حضرت علیؓ ان کا جھگڑا چُکاتے ہیں۔ اسی طرح کا فیصلہ حضرت سلیمان علیہ السّلام اور مہاتما گوتم بُدھ کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔ ایک اور کہانی میں رُوئی کے چور اپنی داڑھیوں کی وجہ سے پکڑے گئے۔ یہ بیربل کا ایک مشہور لطیفہ ہے۔ اس میں ایک کہانی گوشت کی شرط والی ایسی ہے جو انگریزی زبان کے ڈرامہ نگار شیکسپیر کے مشہور ڈرامے 'وینس کا سوداگر' (Merchant of Venice) میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصّہ مشرق و مغرب میں یکساں طور پر مشہور رہا ہے۔ اس طرح کی چند مثالوں کے سوا اکثر کہانیاں مہجور کی طبع زاد ہیں اور نہایت پُرلطف اور دلچسپ ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے داستانوی ادب میں مہجور کس قدر اہم فسانہ گو تھا ـــــ لیجیے! اب ان دلچسپ کہانیوں کو اپنے ہی زمانے کی زبان میں پڑھ کر آپ بھی لطف اُٹھائیے۔

شمیم احمد

پہلا باب

عقل مندوں کی کہانیاں

بُزدِل شیر

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک شیر تھا، جو کسی جنگل میں رہتا اور وہاں راج کرتا تھا۔ اسی جنگل میں ایک بندر بھی رہتا تھا، جو شیر کے گھر کی ہر وقت نگرانی کرتا رہتا تھا۔ بہت دن تک ایک ہی جگہ رہتے رہتے شیر اُکتا گیا تو اس نے سوچا کہ چلو کچھ دن کہیں گھوم پھر آئیں۔ اس نے اپنے گھر کی دیکھ بھال بندر کو سونپی اور سَیر سپاٹے کے لیے کہیں چلا گیا۔ ایک دو روز کے بعد اُدھر سے ایک سیاہ گوش کا گزر ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی تھے۔ سیاہ گوش کو شیر کا گھر بہت پسند آیا۔ اس نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔

"اری نیک بخت! دیکھ تو سہی، ایسا سُندر بن تو ہم نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، شعر

او اِس جا پہ بود و باش کریں
اور گھر کس لیے تلاش کریں"

یہ بات کہہ کر سیاہ گوش نے بیوی بچوں سمیت شیر کے گھر میں ڈیرا جما دیا۔ یہ دیکھ کر

رکھوالے بندر نے کہا۔

"اے سیاہ گوش! کیا تیری عقل ماری گئی ہے۔ دیکھتا نہیں کہ یہ گھر جنگل کے

مہاراجہ کا ہے۔ فوراً یہاں سے چلتا بن نہیں تو اے بے وقوف! تو خواہ مخواہ موت کے پنجے میں گرفتار ہو جائے گا۔"

بندر کے منھ سے یہ کڑوی بات سُن کر سیاہ گوش بولا۔

"ارے جا بندر چھچھندر! کیا بکواس کر رہا ہے۔ آج سے نہیں، یہ جگہ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے ہماری رہی ہے۔"

نڈر سیاہ گوش کا یہ جواب سُن کر میاں بندر نے دل میں سوچا "معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاہ گوش ضرور کوئی بلا ہے، جبھی تو اس طرح اکڑ کر بات کر رہا ہے، ورنہ شیر کا نام تو ایسا ہے کہ سنتے ہی انسان اور حیوان سب کا پتّا پانی ہوتا ہے۔"

بندر تو یہ سوچ کر چُپ ہو رہا، اور چُپ چاپ وہاں سے کھسک گیا، لیکن سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

"یہ گھر جنگل کے شیر راجہ کا ہے، بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اُٹھ چلیں، کسی اور جگہ جا کر بے فکری سے رہیں، بے فائدہ خطرہ مول لینے سے کیا حاصل۔"

اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر سیاہ گوش بولا۔

"اے بی بی تو گھبراتی کیوں ہے؟ میں نے کوئی کچی گولیاں تو کھائیں نہیں۔ جب شیر یہاں آئے گا تو میں وہ کرتب دکھاؤں گا کہ وہ یہاں سے دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔"

اس کی بیوی یہ سُن کر حیران ہوئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"میاں جی! کہیں تمھارے ساتھ بھی گیدڑ اور بھیڑیے کا سا معاملہ نہ ہو جائے۔"

سیاہ گوش نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اے بی بی! وہ گیدڑ اور بھیڑیے کا کیا معاملہ ہے؟"

سیاہ گوش کی بیوی نے جواب دیا۔

"میاں جی! جو میں کہتی ہوں، دھیان سے سُنو اور اس قصّے سے سبق لو۔"

گیدڑ اور بھیڑیے کا قصّہ:

کہتے ہیں ایک بار ایک بھیڑیا کسی گیدڑ کا شکار کرنے کو اس کے پیچھے لپکا، لیکن خوش قسمتی سے، گیدڑ اُس کے ہاتھ نہ آیا اور بھاگ گیا۔ اب تو بھیڑیے کو بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے اپنے دل میں یہ ترکیب سوچی کہ چُپکے سے گیدڑ کے گھر میں گھُس کر بیٹھ جانا چاہیے! آخر جائے گا کہاں؟ ہر پھر کر آئے گا تو اپنے گھر ہی میں، تب لپک کر اُس کی گردن دبوچ لوں گا، اور خوب مزے لے لے کر اُس کا گوشت کھاؤں گا۔ بھیڑیا اپنی اس ترکیب پر بڑا خوش ہوا، اور دبے پاؤں گیدڑ کے گھر میں جا چھُپا۔ دوپہر میں گیدڑ بے فکری سے ٹہلتا ہوا اپنے گھر کی طرف آیا، وہ اندر گھُسنا ہی چاہتا تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے گھر کے دروازے پر انجان پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ نئی بات تھی۔ اُسے خطرے کا احساس ہو گیا اور وہ دروازے پر ہی ٹھٹک کر رہ گیا

اور دل میں لگا یہ کہنے بات
گھر میں بیٹھا ہے اب کوئی بد ذات
کیجیے اس سے ایسی اب حرفت
جس میں اس کی چلے نہ اک فطرت

گیدڑ کو اب ایک نرالی ترکیب سوجھی۔ اُس نے آواز لگائی۔

"اے میرے بے در گھر! میں بے خبر اس وقت تجھ میں آؤں یا نہیں؟"

گھر کے اندر بیٹھے ہوئے بھیڑیے کو گیدڑ کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی، پر وہ جواب میں کچھ نہ بولا، چُپکا بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد گیدڑ نے پھر ہانک لگائی۔

"کیوں میرے بے در گھر! میں بے خبر آؤں یا نہ آؤں؟ کیونکہ میرے اور تیرے درمیان سوال و جواب کی یہ رسم پُرانی ہے۔ یوں کہ پتھر کی بُنیاد مٹی سے ہے اور

پہاڑ کی بُنیاد پتھر پر قایم ہے ، اور تو جانتا ہے کہ پہاڑ کی رسم سوال و جواب کی ہے ، یعنی جب کوئی پہاڑ تلے سے آواز دیتا ہے تو پہاڑ بھی پیاری آواز میں اس کا جواب دیتا ہے۔ سو اب تو جواب دے کہ میں تیرے اندر آؤں یا نہ آؤں ؟"

گیدڑ کی یہ باتیں سُن کر بھیڑیا دل میں سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس گیدڑ کے گھر کی یہی رسم ہے کہ جب یہ گھر آنے کو کہتا ہے تو آنے والا آتا ہے ، نہیں تو نہیں آتا۔ اگر اب کی بار وہ اس گھر سے آواز نہ سُنے گا تو ہرگز نہیں آئے گا اور میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ بدذات گیدڑ اب جو آواز دے تو میں فوراً جواب دوں۔ میاں بھیڑیے دل میں یہ بات سوچ کر تیار بیٹھے ہی تھے کہ گیدڑ نے پھر آواز دی۔

"اے میرے گھر! آج تو مجھ کو جواب کیوں نہیں دیتا ہے ؟" بھیڑیے نے گیدڑ کی آواز سُنتے ہی جھٹ جواب دیا۔

"آجا بھائی! میں تیرا ہی گھر ہوں۔ بے دھڑک چلا آ۔"

گیدڑ نے جو اپنے گھر کے اندر سے اُس بھیڑیے کی آواز سُنی تو ناچتا گاتا بھاگ کر اُس چرواہے کے پاس پہنچا جو اس بھیڑیے کا جانی دشمن تھا۔ چرواہا بھیڑیے کا اتہ پتہ معلوم کر کے جھولی میں بہت سارے پتھر ڈال کر سیدھا وہاں آیا اور گیدڑ کے گھر پر بے تحاشا پتھر برسانے لگا۔ آخر کار پتھروں کی مار کھاتے کھاتے بھیڑیا مر گیا۔"

یہ قصّہ سُنا کر سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

"تو اے میاں جی! مجھے ڈر ہے کہ تو جو اُس بھیڑیے کی سی حرکت کر رہا ہے کہیں یہ ہم سب کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔"

بیوی کی یہ بات سُن کر سیاہ گوش نے جواب دیا۔

"اے نیک بخت! وہ بھیڑیا گدھا تھا، اُس بے وقوف کی سمجھ میں اتنا بھی نہ آیا کہ مٹی کا گھر بھی کہیں بولتا ہے، جو گیدڑ کو جواب دیتا۔ سیدھی سی بات تھی کہ وہ جس طرح چُپ چاپ بیٹھا تھا، اُسی طرح بیٹھا رہتا۔ گیدڑ دو چار بار اور آواز لگاتا جب کچھ جواب نہ پاتا تو اس کے دل سے گھر کے سامنے پیروں کے نشان کا وہم نکل جاتا، اور بے دھڑک اپنے گھر میں گھس جاتا۔ تب بھیڑیا اُس کو پکڑ لیتا اور اُس کی ہڈیاں چبا جاتا۔"

ابھی سیاہ گوش اور اُس کی بیوی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک طرف سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ دل دہلا دینے والی شیر کی یہ آواز سُن کر سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

"میاں جی! اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اچھا ہے کہ فوراً یہاں سے بھاگ چلیں۔ مفت جان دینے سے کیا حاصل؟"

"اے نیک بخت! تو بالکل خوف نہ کھا۔" سیاہ گوش نے دلاسا دیتے ہوئے جواب دیا۔ "بس تو ایک کام کیجو! جس وقت شیر کی آواز بالکل گھر کے پاس آئے تو تُو ان بچّوں کو رُلا دینا۔ پھر آگے میں سمجھ لوں گا۔" پھر بیوی کے کان میں کچھ کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شیر دہاڑتا ہوا اپنے گھر کے قریب آپہنچا۔ سیاہ گوش کی بیوی نے اپنے میاں کی بتلائی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے بچّوں کو رُلا دیا۔ بچّوں کے رونے کے بعد سیاہ گوش بولا۔

"اے نیک بخت! یہ بچّے آج بے وقت کیوں رو رہے ہیں؟"

سیاہ گوش کی بیوی نے جواب دیا۔

"ان کم بختوں کو تو نے شیر کے گوشت کی جو چاٹ لگا دی ہے، سو یہ شیر کی بو سونگھ کر اپنی من پسند غذا مانگ رہے ہیں۔ ویسے تو کل ہی تو ہاتھی گینڈوں کو

شکار کرکے لایا تھا جن کا ڈھیر سارا گوشت گھر میں رکھا ہوا ہے، مگر شیر کا گوشت کھائے بغیر ان کی بھوک ہی نہیں مٹتی۔"

یہ بات سُن کر سیاہ گوش نے کہا۔

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ان کو دِلاسا دے دے، خدا سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔

یعنی خدا نے ان کی دل پسند غذا بھیج دی ہے۔ بس پَل بھر میں شیر کا تازہ تازہ گوشت لاکر انھیں کِھلاتا ہوں۔"

جنگل کے مہاراج ادھیراج میاں شیر نے جو یہ بات سُنی تو مارے ڈر کے سہم گئے، اور دل میں سوچنے لگے۔

'یہ تو کوئی بہت خطرناک بَلا معلوم ہوتی ہے۔'

اِس خیال کا آنا تھا کہ شیر ناک کی سیدھ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے گھر کے رکھوالے بندر نے جو یہ اَن ہونی بات دیکھی تو وہ بھی شیر کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

"اے مہاراج! ٹھہرو تو! ذرا میری بات تو سُنو! اس قدر بے حواس ہوکر کیوں بھاگے جا رہے ہو۔" مگر شیر نے ایک نہ سُنی اور بھاگا ہی چلا گیا۔ بندر بھی اُس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اُس نے پھر آواز دی۔

"ارے بھائی! ذرا رُک جاؤ! اور میری بات سُن لو۔"

شیر دَم بھر کے لیے رُک گیا۔ تب بندر نے کہا۔

"ایک بالشت بھر کمزور جانور سے جنگل کے راجہ کو یوں ڈرنا نہیں چاہیے۔ کہیں ہاتھی بھی چیونٹی سے ڈرتا ہے۔ تم شیر ہوکر ایک کمزور سیاہ گوش کے ڈر سے

بھاگ رہے ہو۔"

بندر کی یہ باتیں سُن کر شیر کی کچھ ہمت بندھی، اور وہ اپنے گھر کی طرف لَوٹا۔
سیاہ گوش نے جو دیکھا کہ دُشمن نے پھر اِدھر کو مُنھ پھیرا تو اپنی بیوی سے کہا۔
" ذرا بچوں کو پھر اُسی طرح رُلا دینا، پھر دیکھ اللہ کی قُدرت کا کیا تماشا نظر آتا ہے۔"

سیاہ گوش کی بیوی نے شیر کے نزدیک آتے ہی بچّوں کو پھر رُلا دیا۔ سیاہ گوش نے بچّوں کے رونے کی آواز سُن کر کہا۔

" اے بی بی! تو آخر بچّوں کو تسلّی کیوں نہیں دیتی۔ اِتنا کیوں گھبراتے ہیں۔ شیر میرے چُنگل سے بچ کر جا کہاں سکتا ہے۔ یہ بندر مچھندر میرا بڑا پُرانا اور وفادار یار ہے۔ ابھی دیکھنا کہ بھاگے ہوئے شیر کو کس ہوشیاری اور مکّاری سے بہلا پُھسلا کر واپس لاتا ہے۔ بس ذرا میرے سامنے آنے دے، پھر دیکھتا ہوں کہاں بچ کے جائے گا۔ اللہ نے چاہا تو پَل بھر ہی میں اُس کا تازہ گوشت لا کر اِن کو کِھلاتا ہوں۔"

اب جو شیر نے یہ بات سُنی تو کہا۔

"کیا خوب! دُشمن کہاں؟ بغل میں۔ یہ مکّار بندر مچھندر اِسی واسطے مجھے سمجھا کے لایا ہے کہ میں تو مارا جاؤں اور خود بچا رہے۔" یہ کہہ کر شیر نے ایک زوردار تھپڑ بندر کے ایسا جڑا کہ اُس کی جان ہی نکل گئی، پھر ایسا سرپٹ بھاگا کہ میلوں اور کوسوں پلٹ کر نہیں دیکھا۔

عورت، چیتا اور لومڑی

ایک بدنصیب آدمی کی بیوی بڑی جھگڑالو تھی۔ ایک بار وہ اپنے میاں سے جھگڑا کرکے اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے بچّوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکل گئی اور ایک لق و دق جنگل میں جا پہنچی۔ اتنے میں رات ہو گئی اور چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ عورت دونوں بچّوں سمیت ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ جنگل بڑا ہولناک تھا۔ ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔ اب تو عورت کو بہت ڈر لگا۔ مارے ڈر کے اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ اب تو وہ بہت پچھتائی کہ اُس نے یہ کیسی بے وقوفی کی۔ دل ہی دل میں خود کو کوستی تھی، اور کہتی تھی مجھ کم بخت کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی کہ یہ طوفان اُٹھایا، میاں سے جھگڑا کیا اور اِس مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ اللہ کرے کہ جلدی سے صبح ہو جائے کہ یہاں سے اُٹھ کر اُلٹے پیروں سیدھی گھر جاؤں۔ توبہ توبہ! اب کبھی ایسی حرکت نہ کروں گی۔ میاں کا کہا نہ ٹالوں گی، ہمیشہ اُن کی بات مانوں گی۔

غرض یہ کہ وہ عورت دل ہی دل میں توبہ تِلّا کر ہی رہی تھی کہ اچانک ایک خونخوار چیتا اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چیتے کو دیکھتے ہی اُس کے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ لیکن ذرا ہی دیر میں اس نے خود پر قابو پا لیا اور دِل میں بولی۔

پھیر نا مُنھ کو نہ اب چاہیے مر جانے سے　　　جو بھی ہونا ہے وہ ٹلتا نہیں

سو اُس عورت نے ہمّت کر کے چیتے سے کہا۔

"اے چیتے! آ، میرے قریب آ، اور میری ایک ضروری بات سُن جا۔ تیرے دل کی مُراد پوری ہوگی۔"

عورت کی اِس ہمّت پر چیتے کو بڑا تعجب ہوا، بولا۔

"اے عورت! وہ کون سی نرالی بات ہے، جو تُو مجھے سُنانا چاہتی ہے؟"

عورت نے جواب دیا۔

"اے چیتے! بس کچھ نہ پوچھ۔ اِس جنگل کے شیر نے میرے شہر پر موت کا وہ پنجہ چلایا کہ سارا شہر تباہ و برباد ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخرکار شہر کے سارے باشندوں نے آپس میں بیٹھ کر یہ مشورہ کیا کہ شیر کھانے کو تو ایک وقت میں دو تین آدمی کھا جاتا ہے، لیکن اِس سے تمام شہر میں خواہ مخواہ دہشت پھیل جاتی ہے، اِس سے تو یہ بہتر ہے کہ شیر کے کھانے کے لیے روز کے تین آدمی مقرّر کر دیے جائیں تاکہ اس مستقل آفت سے باقی شہر تو بچا رہے۔ سو، اے چیتے! آج کے روز مجھ غم کی ماری کی باری۔ ہے، اِس واسطے اِس ہولناک جنگل میں دونوں بچّوں سمیت آئی ہوں۔ لیکن اے چیتے! میں دل جلی، درویشوں کی اولاد سے ہوں۔ مجھ سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ اگر اِس وقت تُو میرے مزے دار گوشت سے اپنا پیٹ بھرنا چاہتا ہے، تو کوئی حرج نہیں! آ اور مجھے کھالے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں، مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔ تو صرف ایک بچّے کو اور آدھا مجھ کو بہ خوشی کھا سکتا ہے۔ اور میرا آدھا وجود اور دوسرا بچّہ تجھے شیر کے واسطے چھوڑنا ہوگا کیونکہ میں مصیبت کی ماری اُسی کے واسطے اِس جنگل میں آئی ہوں۔"

عورت کی یہ عجیب بات سُن کر چیتا دنگ رہ گیا۔ بڑے تعجّب سے وہ بولا۔

"اے نیک عورت! تجھ سی سخی عورت ہم نے آج تک نہیں دیکھی، جو یوں اپنے دُشمن کو کھانے کی چیزیں مہیا کرے۔ شعر

یہ سخاوت کہیں نہیں دیکھی
تجھ میں اے نیک بخت ہے جیسی"

چیتے کی یہ بات سُن کر عورت نے جواب دیا۔

"اے میرے چھیتے چیتے! درویشوں کے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ درویشوں کے تو ایسے ہزاروں لاکھوں قصّے ہیں، تو کہاں تک سُنے گا، اور میں کہاں تک سُناؤں گی! پر اے پیارے چیتے! اِن باتوں سے اب فائدہ بھی کیا، آج تو مجھے مرنا ہی ہے، میرا گوشت پوست سب برباد ہو جائے گا۔ اگر شیر نے کھایا تو کیا، اور تو نے کھایا تو کیا۔ لیکن اے چیتے! تو مجھ کو کھا کر یہاں سے جلدی بھاگ کھڑا ہو، کیوں کہ شیر کسی کا جھوٹا شکار کبھی نہیں کھاتا، البتّہ اُس کا مارا ہوا شکار ہر کوئی جانور، چرند اور پرند کھا لیتا ہے۔ اِسی لیے کہہ رہی ہوں کہ جب شیر یہ سُنے گا کہ میرا شکار چیتا کھا گیا ہے تو پھر اِس جنگل میں تیری اور تیرے بیوی بچّوں کی خیر نہیں۔"

چیتے نے جو شیر کا نام سُنا تو دُم دبا کر ایسا سرپٹ بھاگا کہ کئی کوس تک پلٹ کر دیکھنے کی ہمّت نہ ہوئی۔

راستے میں اُسے ایک لومڑی ملی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک بدحواس چیتا بھاگا چلا جا رہا ہے، وہ چیتے کے سامنے آئی اور اُسے روک کر بولی۔

"اے بھائی ذرا دَم تو لے۔ ہونقوں کی طرح ایسا سرپٹ کہاں بھاگا جا رہا ہے؟"

چیتے نے رُک کر ہانپتے کانپتے لومڑی کو اُس مکّار عورت اور شیر کا قصّہ سُنایا۔

لومڑی یہ قصّہ سُن کر مُسکرائی اور چیتے کو لعنت ملامت کرتی ہوئی بولی۔

" واہ رے میرے شیر! مجھے تیری دلیری اور غرور میں تو کوئی شک نہیں، پر عقل سے تو ضرور خالی ہے۔ سچ ہے! اللہ تعالیٰ نے دماغ اور عقل کی دولت انسان جیسی کمزور مخلوق ہی کو عطا کی ہے۔ ارے بے وقوف! تو ایک مکّار عورت کے فریب میں ایسا آگیا کہ تیرے ہوش ہی اُڑ گئے۔ میری بات مان اور اگاڑی سے مُنھ موڑ کر پچھاڑی کو چل۔ ہاتھ آیا ہوا شکار یوں مفت ہاتھ سے نہ جانے دے۔ بے وقوف! ایسے تر لقمے کو کوئی ہاتھ سے یوں کھوتا ہے۔ چل! آ میرے ساتھ، تیرے طفیل میں بھی آج خوب پیٹ بھر کے کھاؤں گی اور تیرے لیے دعا کروں گی۔ مثل مشہور ہے۔۔۔ جس کا کھائے اُس کا بجائے۔"

چیتے نے لومڑی کی یہ بات سُن کر جواب دیا۔

" اے پیاری پیاری لومڑی! تو کہتی تو ٹھیک ہے، اور میں واپس پلٹ بھی سکتا ہوں، پر مجھے شیر سے بہت ڈر لگ رہا ہے، خواہ مخواہ وہ بَلا کی مانند میرے پیچھے پڑ گیا تو اُس کے پنجے سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔ تیرا کیا، تو اپنے بِل میں چُھپ کر بچ جائے گی۔"

لومڑی نے چیتے کی یہ بُزدلانہ بات سُن کر کہا۔

" اے چیتے! اگر تجھے میری اِس بات پر بھروسا نہیں ہے، تو ایک کام کر۔ میرا پاؤں اپنے پاؤں سے مضبوط باندھ لے، اور اُس مکّار عورت کے پاس بے کھٹکے چل۔ اگر اُس گھڑی شیر آجائے تو مجھے تو اُس کے آگے پھینک کر بھاگ جانا۔"

آخر چیتے نے لومڑی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے پاؤں سے لومڑی کے ایک پاؤں کو باندھا اور دونوں گھسٹتے ہوئے عورت کے پاس آئے۔ عورت نے جو یہ عجیب رنگ ڈھنگ دیکھا، تو وہ فوراً بولی۔

" اے چیتے! خوب، بہت خوب! سچ ہے! اِسے کہتے ہیں رزق! تو پھر آپ سے

آپ میرے پاس آگیا، ورنہ میں تو تیرے سامنے شیر کی من گھڑت کہانی کہہ کر بہت شرمندہ تھی اور پچھتا رہی تھی کہ غیب سے آیا ہوا رزق مفت ہاتھ سے کھو دیا! اے چیتے! سچی بات یہ ہے کہ میں ایک جادوگرنی اور ڈائن ہوں۔ جنگل جنگل جاکر موٹے تازے شیر اور چیتوں کے گوشت کے کرکرے کباب کھاتی ہوں، یہ میری پسندیدہ خوراک ہے۔ ہاتھیوں اور گینڈوں کے گوشت کا جب تک شوربہ نہیں پی لیتی تب تک کچھ مزہ نہیں آتا۔ اور تو جو یہ بالشت بھر کی لومڑی کو اپنے ساتھ لایا ہے، تو اس سے تو میری داڑھ بھی گرم نہ ہوگی۔ بقول شخصے ـــــــ

اونٹ کے منہ میں زیرہ!

ہاں! اس کی نرم نرم اور پتلی پتلی ہڈیاں میرے بچے بڑے چاؤ سے کھالیں گے۔"

لومڑی نے جو یہ دہشت ناک بات سنی تو اس کی سٹی گم ہوگئی اور کانپتے ہوئے چیتے سے بولی۔

"اے چیتے! سچ مچ یہ عورت تو کوئی آسمانی بلا، اور ناگہانی آفت معلوم ہوتی ہے، اگر تو اپنی جان کی امان چاہتا ہے تو یہاں سے فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ چل۔"

چیتا تو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا، لومڑی کی بات سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ لومڑی جو چیتے کے پاؤں سے بندھی تھی، گھسٹنے سے بری طرح زخمی ہوگئی۔ اس کا سارا بدن چھل گیا۔ لومڑی سے جب یہ تکلیف برداشت نہ ہوئی تو بولی۔

"اے چیتے! ذرا آہستہ بھاگ! دیکھ تو سہی میں لہولہان ہوگئی۔"

چیتا بولا۔

"اے لومڑی! یہ کیا غضب ہے کہ تو نے اپنے آپ کو میرے پاؤں سے بندھوایا، میں تو خود تیری وجہ سے جیسا چاہیے ویسا بھاگ نہیں سکتا۔ اگر اس حالت میں وہ جادوگرنی ہم پہ چڑھ دوڑی تو ایک ہی آن میں مجھے اور تجھے چٹ کر

جائے گی۔"

غرض کہ لومڑی نے جیسے تیسے کر کے اپنے آپ کو چیتے کے پاؤں سے چھڑایا اور لپک کر اپنے بِل میں جا چھپی اور چیتا وہاں سے ایسا بھاگا کہ کہیں پتہ نہ لگا۔

صبح ہو گئی، تو عورت کے بھی ہوش و حواس بجا ہوئے۔ فوراً وہاں سے اُٹھی اور دونوں بچّوں کو لے کر اپنے گھر واپس آ گئی۔

شیر بچّہ اور بڑھئی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شیر نے اپنے بچّے کو نصیحت کی کہ ' بیٹا تو کبھی کسی بھی جنگلی جانور اور دریائی حیوان سے خوف نہ کھا ۔ پر جلّاد صفت انسان کے پاس ہرگز نہ جانا کیونکہ سب آدمی بڑے پُر آفت اور خطرناک ہوتے ہیں۔ شعر

ایک ادنیٰ ہے ان کی یہ تقریر
جس کو چاہیں کریں سخن میں اسیر

کچھ دنوں بعد کی بات ہے کہ جب وہ شیر بچّہ کچھ سمجھ دار ہوا تو ایک روز جنگل کی سیر کو نکلا۔ راستے میں اُسے ایک ہاتھی نظر آیا۔ شیر بچّہ ہاتھی کو دیکھ کر سہم گیا۔ اُدھر ہاتھی بھی شیر بچّے کو دیکھ کر بہت ڈرا۔ شیر بچّے نے جو ہاتھی کو ڈرتے دیکھا تو اس نے سوچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدم زاد نہیں ہے ، بلکہ کوئی جنگلی جانور ہے۔ پھر بھی اُس نے آگے بڑھ کر ہاتھی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی! سچ بتا، تو آدمی ہے یا کوئی اور جانور ہے؟"

اُس ہاتھی نے جواب دیا۔

" اے بھائی شیر! آدمی زاد بہت جلّاد ہوتے ہیں۔ ایں لمبے تڑنگے اور چوڑے چکلے قد و قامت کے باوجود ہم بھی اُن سے ہر وقت ڈرتے ہیں۔ قسمت کے مارے اگر کبھی دھوکے سے ہم اُن کے ہاتھ آجاتے ہیں تو وہ ہم پر بیٹھ کر خوب

سواری کرتے ہیں، اور تیز اور نوکیلی آنکس سے ہمارا سر خونا خون کر دیتے ہیں۔ شعر

کسی کو خدا ان سے ڈالے نہ کام
وہ ہیں الغرض سب کے سب نیک نام"

ہاتھی سے یہ گفتگو سُن کر شیر بچہ جب کچھ اور آگے بڑھا تو اُسے اب کی بار ایک بے نکیل اُونٹ نظر آیا۔ اونٹ کو دیکھ کر شیر بچہ ڈر گیا اور دل میں سوچنے لگا: یہ تو ضرور ہی آدمی زاد ہوگا کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں بڑے لمبے لمبے ہیں؛ یہ سوچ کر وہ ذرا دیر چُپ چاپ کھڑا رہا۔ اُدھر میاں اونٹ نے جو شیر کی صورت دیکھی تو مارے ڈر کے اُن کی سِٹّی گُم ہو گئی۔ آخر کار شیر بچے نے اپنے ہوش و حواس جمع کیے اور اونٹ سے پوچھا۔

بھئی! "کیا تو انسان ہے؟"

اونٹ نے جواب دیا۔

"اے یارِ غم خوار! آدمی زاد ایسے جلاد ہوتے ہیں کہ اگر ہم کبھی اُن کے ہتّھے چڑھ جاتے ہیں تو وہ ہماری ناک میں نکیل ڈال دیتے ہیں اور ہماری پیٹھ پر منوں بار لاد کر جہاں چاہتے ہیں، وہاں لیے پھرتے ہیں۔ شعر

کوئی اُن سے ہرگز بر آتا نہیں
کوئی آنکھ اُن سے مِلاتا نہیں"

اونٹ کی زبانی یہ گفتگو سُن کر شیر بچہ آگے بڑھ گیا۔ اب کی بار ایک پہاڑی کے نیچے اُسے ایک بیل نظر آیا۔ بیل کو دیکھ کر شیر بچے نے سوچا: شاید یہی آدمی زاد ہے؛ یہ سوچ کر وہ مارے ڈر کے کھڑا ہو گیا۔ اُدھر بیل نے بھی جب شیر بچے کو دیکھا تو بہت ڈرا۔ اِس بار پھر شیر بچے نے ہِمّت کر کے بیل سے پوچھا۔

"اے یارِ غم خوار! سچ بتا تو آدمی زاد ہے یا کوئی اور چیز ہے؟"

بیل نے بھی وہی جواب دیا جو ہاتھی اور اونٹ نے اس سے پہلے دیا تھا۔ اُس نے کہا۔

"اے بھائی شیر! آدم زاد نہایت جلّاد ہوتے ہیں۔ اگر ہم بد قسمتی سے اُن کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں تو ہماری ناک میں رسّی ڈالتے ہیں، گاڑی میں جوتتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہم سے لیتے ہیں، اس کے بعد دن رات کی محنت کرتے کرتے جب ہم مر جاتے ہیں تو بڈھے اور جوان ہماری کھال کی جوتیاں پہنتے ہیں۔"

بیل کی بات سُن کر بھی شیر بچّہ مایوس ہوا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اس بار سچ مچ انسان سے اُس کا سامنا ہوا۔ یہ انسان ایک بڑھئی تھا، جو کندھے پر اپنے اوزار رکھے ہوئے کسی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ شیر بچّے کی جو نظر بڑھئی پر پڑی تو وہ سہم گیا۔ بڑھئی نے شیر بچّے کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ وہ میرے ڈر سے دُم دبا رہا ہے، تو وہ بے جھجک آگے بڑھ گیا۔ شیر بچّے نے سوچا، یہ آدمی زاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو بڑا کمزور سا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے؟ یہ سوچ کر شیر بچّہ چالاکی سے آگے بڑھا اور بڑھئی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی! سچ بتاؤ! تم آدمی زاد ہو؟"

بڑھئی نے جواب دیا۔

"آدمی ہم تو ہیں پہ تجھ کو کیا
اس طرح تو جو پوچھتا ہے بھلا"

شیر بچّے نے کہا۔

"اے آدمی زاد! اکثر میرا باپ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ بیٹا تُو کسی سے نہ ڈرنا لیکن آدمی زاد کو اپنا جلّاد سمجھنا۔ سو آج تجھے دیکھ کر باپ کی نصیحت غلط

معلوم ہوئی ۔ تجھ میں تو مجھے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جو میں تجھ سے ڈروں ۔"

شیر بچے کی یہ بات سُن کر بڑھئی نے جواب دیا۔

"یہ تو سچ ہے کہ ہماری کچھ حقیقت اور حیثیت نہیں، لیکن ہماری آدمیت بڑی چیز ہے ۔"

شیر بچے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ قطعہ

"تیری تو کچھ نہیں حقیقت ہے
لیک کیسی وہ آدمیت ہے
جس سے پیل و پلنگ و شیر دلیر
اس شجاعت سے لیتے میں مُنھ پھیر"

بڑھئی نے شیر بچے کی یہ بات سُن کر جواب دیا۔

" ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ذرا ٹھہر جا۔ ہم اپنی آدمیت کا کرشمہ ابھی دکھائے دیتے ہیں ۔"

یہ کہہ کر بڑھئی نے اپنی کلہاڑی سے ایک درخت کا بڑا سا ٹہنا کاٹا اور اُسے بیچ میں سے آدھا چیر کر دو شاخا نُما، جس میں شیر بچے کی گردن آسانی سے آجائے، طوق سا بنایا۔ اور تب شیر بچے سے کہا۔

" اے شیرِ دلیر! آ، اِس سوراخ میں اپنا سر ڈال کر ہماری آدمیت کو دیکھ! پھر دیکھ کیا تماشا نظر آتا ہے ۔"

شیر بچے کی جو کم بختی آئی تو اُس نے بڑھئی کی باتوں میں آکر دو شاخا نُما طوق میں اپنا سر ڈال دیا۔ بڑھئی نے پھرتی سے طوق کے اوپری کھُلے ہوئے حصّوں کو مِلایا اور اُن میں ایک موٹی سی کیل ٹھونک دی، جس سے کہ شیر بچے

کی گردن کس گئی۔ شعر

"اور کہا تو تو بے حقیقت ہے
آدمی کی یہ آدمیت ہے"

غرض کہ شیر بچے نے بہت سر مارا لیکن طوق کے اندر سے اُس کا سر نہ نکلا۔ آخرکار بیچارا شیر بچہ سر پٹک پٹک کر مر گیا اور بڑھئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گانے والی بکری

ایک کمزور و ناتواں بکری تھی۔ ایک بار یوں ہوا کہ وہ کمزوری کی وجہ سے اپنے گلّے سے پیچھے رہ گئی۔ بدقسمتی سے اسی وقت ایک خونخوار بھیڑیے سے اُس کا آمنا سامنا ہوگیا۔ بھیڑیے کو دیکھ کر بکری بہت ڈری اور دل میں سوچنے لگی۔

"ہائے! یہ تو بڑا غضب ہوا کہ اِس وقت اِس خونخوار بھیڑیے سے سامنا ہو گیا۔ اب کیا کروں! اگر اِس وقت جان بچا کر بھاگنا بھی چاہوں تو مجھ سے اِتنا تیز بھاگا بھی کہاں جائے گا! بھیڑیا مجھ سے تیز بھاگے گا اور پَل بھر میں مجھے دبوچ لے گا۔ اب اگر چرواہے کو آواز بھی دوں تو یہ ظالم بھیڑیا بالکل قریب آن پہنچا ہے، جب تک چرواہا اِتنی دُور آئے گا تب تک تو یہ بدبخت میری ہڈیاں چبا ڈالے گا۔"

کیا کروں ہائے کوئی بات نہیں بن آتی
مفت میں جان میری وائے ستم ہے جاتی

بکری کمزور تھی تو کیا ہوا، تھی تو عقل مند! اُس نے ایک ترکیب سوچی اور اس ترکیب سے خوش ہوتی ہوئی بھیڑیے کے قریب آئی اور بولی۔

"اے بھیڑیے! خوش ہو جا۔ خوش ہو جا۔ میں تیری ہی تلاش میں اِس جنگل میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔"

یہ عجیب و غریب اور انوکھی بات سُن کر بھیڑیے نے تعجب سے کہا۔

" اے کمزور و ناتواں بکری! تو کس وجہ سے میری تلاش میں ہے؟ کوئی بھی اپنے دُشمن کو دوستی سے تلاش کرتا ہے؟ یا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی اپنی مرضی سے کنویں میں گرا ہو! اے دیوانی بکری تو اپنی نادانی کی باتوں سے میرے دل کو پریشان نہ کر۔"

بھیڑیے کی بات سُن کر بکری بولی۔

" اے شیروں کے شیر بھیڑیے! اور اے چیتا صفت بھیڑیے! تیری تلاش کا سبب یہ ہے کہ میرا گلہ بان بڑا شریف آدمی ہے، ہمیشہ اس کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ بڑا شریف اور دوست نواز آدمی ہے۔ آج اس نے مجھ سے کہا۔ اے میری پیاری بکری! میں اس جنگل کے بھیڑیے سے بہت خوش ہوں۔ وہ میرا بڑا یار ہے۔ کیونکہ اُس نے آج تک میرے گلے کو کبھی تکلیف نہیں پہنچائی۔ سو اب میرا بھی فرض ہے کہ میں اپنے دوست کی اس مہربانی کا بدلہ چکاؤں۔ سو میں نے سوچا ہے کہ اس کی دعوت کروں! اس لیے تو میرے دوست بھیڑیے کے پاس جا اور اپنی جان نثار کر کے اس کی مزیدار غذا بن۔ تو اے میرے گلّے بان کے پیارے دوست بھیڑیے! میں اِس جنگل میں تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں، تاکہ تو میرے ذائقہ دار گوشت سے خوب پیٹ بھر کر سیر ہو سکے! سچ کہہ رہی ہوں! میری اِس بات کو تو چاپلوسی نہ سمجھنا۔ لیکن اے بھائی بھیڑیے! ایک بات اور ہے۔"

" وہ کیا بات ہے؟" بھیڑیے نے بہ اشتیاق پُوچھا۔

بکری نے کہا۔

" یہ تو طے بات ہے کہ تجھے میرا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آئے گا۔ لیکن

مزے کی بات یہ بھی ہے کہ مجھے بڑا میٹھا اور رسیلا گانا بھی آتا ہے۔ بے شک تو بے گمان اس آن مجھے کھائے گا۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تیرے کھانے کا مزہ دو بالا ہو جائے۔ پہلے میرے سُریلے گانے سے اپنے کانوں میں مٹھاس گھول اور پھر میرے چٹ پٹے گوشت سے اپنے مُنھ کے ذائقے کو نمکین کر۔ گانا سُننے سے تجھ پر جو سرور چھائے گا اور اس کے بعد مجھے کھائے گا تو دوگنی لذّت پائے گا۔ تو نے یہ مشہور مثل تو ضرور سُنی ہوگی۔

ایک تو کریلا کڑوا، دوسرے نیم چڑھا

یعنی ایک تو عالمِ سرور اور دوسرے گوشت لذیذ۔ یہ بڑی نادر بات ہے۔"

اس عقل مند بکری کی یہ بات سُن کر وہ گدھا بھیڑیا بولا۔

"اِس سے بہتر کیا بات ہے؟ نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

غرض کہ بکری، اس بے وقوف بھیڑیے کو ایک ٹیلے پر لے گئی اور وہاں اُسے ایک طرف بِٹھا کر بلند آواز سے جو الاپی تو اُس کے چرواہے نے یہ آواز سُن لی۔ چنانچہ وہ بکری کی آواز کی سمت میں دَوڑتا ہوا اُس ٹیلے پر آیا۔ چرواہے نے جو بھیڑیے کو دیکھا تو اپنا لٹھ اس زور سے پھینک کر مارا کہ بھیڑیے کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ بھیڑیا لنگڑاتا ہوا بھاگ کر جنگل میں جا چُھپا اور گلہ بان اپنی اس کمزور و ناتواں لیکن عقل مند بکری کو بغل میں داب کر خوشی خوشی اپنے گلّے میں لے آیا۔

انوکھی تقسیم

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی دولت مند شخص کے گھر ایک شام کوئی آدمی بہ طور مہمان آیا۔ وہ دولت مند شخص تھا مہمان نواز۔ اُس نے نہایت پُرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا۔ دسترخوان پر قسم قسم کے لذیذ اور ذائقہ دار کھانے، مُربّہ و اچار سمیت چُنے گئے۔ ان میں چار بھُنے ہوئے خوش ذائقہ سالم مُرغ بھی تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کھانے والے دسترخوان پر پانچ لوگ تھے۔ ایک تو خود میزبان یعنی دولت مند آدمی، ایک اُس کی بیوی، دو اُس کے بیٹے، اور پانچواں یہ مہمان۔ دولت مند آدمی خوش مذاق بھی تھا۔ اُس نے اپنے اس معزز مہمان سے کہا۔

"اے عزیز باتمیز! کھانے والے تو ہم پانچ لوگ ہیں، پر یہ بھُنے ہوئے سالم مُرغ کُل چار ہیں۔ سو بھائی اِن چاروں مُرغوں کی ہم پانچوں میں اِس دانائی کے ساتھ تقسیم کرکہ کسی مُرغ کو کاٹنا بھی نہ پڑے اور چاروں کے چاروں ہم پانچوں میں تقسیم بھی ہو جائیں۔"

میزبان نے مہمان کے کہنے کے مطابق مُرغوں کی تقسیم کر دی۔ اس طرح۔

ایک مُرغ پلیٹ میں رکھ کر میاں اور بیوی کے آگے رکھ دیا اور کہا۔

"یہ ایک مُرغ تم دونوں کے حصّے میں ہے۔"

ایک مُرغ اُس کے دونوں بیٹوں کے آگے رکھ دیا اور بولا۔

"یہ ایک مُرغ اِن دونوں کے لیے ہے۔"

بچے ہوئے دو مُرغ خود اپنے سامنے رکھے اور کہا۔

"یہ دو مُرغ میرا حصّہ ہیں۔"

میزبان نے جو یہ انوکھی تقسیم دیکھی، تو اُسے بڑا غصّہ آیا۔ دل میں بہت کُڑھا۔ لیکن مہمان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی دبی زبان سے اِتنا بولا۔

"کیوں بھئی! تو نے یہ کیسا حصّہ کیا کہ خود اکیلے نے تو دو مُرغ لیے اور ہم چار آدمیوں کو صرف دو مُرغ دیے۔ قطعہ

منصفی اپنے دل میں آپ تو کر
ایسی تقسیم ہے کہیں بہتر؟
غیر کو کیا غضب ہے کم دیجے
ہاتھ سے اپنے خود بہت لیجے"

میزبان کی یہ بات سُن کر مہمان خفگی سے بولا۔

"اے نافہم! سمجھ تو سہی۔ تم میاں بیوی اور یہ ایک مُرغ، تین پورے ہوئے یا نہیں۔ یہ دو بھائی اور ایک مُرغ، تین ہوئے کہ نہیں۔ اور، میں تنِ تنہا اور یہ دو مُرغ، یہ بھی تین ہوئے کہ نہیں۔ سو بھائی! حساب برابر۔ کم نہ زیادہ۔ اِس سے صحیح، برابر اور منصفانہ تقسیم اور کیا ہو سکتی ہے۔ تو نے خواہ مخواہ مجھے قصور وار ٹھہرانا اور ناانصافی کا الزام مجھ پر رکھا۔"

میزبان بے چارہ لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔

تین سوال، ایک جواب

ایک بڑا پہنچا ہوا درویش تھا۔ اُس کے پاس ایک ایسا شخص آیا جو خُدا اور خُدا کی بتلائی ہوئی باتوں پر شک کرتا تھا۔ اُس نے اُس پاک، دل بزرگ سے کہا۔

"اے درویش! میں تیری خدمت میں تین بڑے ٹیڑھے سوال لایا ہوں، ان کا جواب دے تو جانوں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ سب لوگ کہتے ہیں کہ خُدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، مگر مجھے تو کسی جگہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر خُدا ہے تو مجھے میری آنکھوں سے دکھا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ انسان خُدا کا بندہ ہے، وہ خود کچھ نہیں کرتا، جو کچھ کرتا ہے، خُدا کرتا ہے، انسان تو کمزور و ناتواں ہے، حق تعالیٰ کی قدرت و طاقت اور اُس کے ارادے کے بغیر انسان کوئی کام نہیں کر سکتا، جب یہ بات ہے تو پھر انسان کو جُرم اور قصور کی سزا کیوں دی جاتی ہے۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ شیطان بے ایمان کو سزا دینے کے لیے دوزخ میں ڈالے گا۔ یہ عجیب بات ہے! دوزخ کی آگ اس سرکش کو کیوں کر عذاب دے گی جبکہ وہ خود آگ کا بنا ہوا ہے۔ بھلا آگ بھی کہیں آگ کو جلا سکتی ہے؟"

درویش نے جو اس دہریے کی یہ بات سُنی تو مُنھ سے تو کوئی جواب نہ دیا البتہ ایک بڑا سا ڈھیلا اُٹھا کر اُس کے سر پر مار دیا۔ مُنھ سے پھر بھی کچھ نہ بولا۔ خاموش ہی رہا۔ وہ شخص روتا پیٹتا اور بلبلاتا ہوا قاضی کے پاس گیا اور درویش کی شکایت کی۔

"میں نے فلاں ظالم درویش سے تین سوال کیے تھے، پر اُس نے ان کا جواب اِس طرح دیا کہ مارے دردِ سر کے میرا بُرا حال ہے۔"

قاضی نے اُس درویش کو بُلوا کر کہا۔

"اے پاک دل بُزرگ! تُو نے اِس بے قصور کو ڈھیلا کیوں مارا۔ دیکھ تو سہی دردکے مارے اِس کی جان نکل رہی ہے۔"

اِس کے جواب میں وہ بُزرگ درویش بولا۔

"وہ ڈھیلا اِس کے سوالوں کا جواب تھا، لیکن یہ نہیں سمجھا، نہیں تو پتّھر کا ہو جاتا، یعنی اِس کو چوٹ اثر نہ کرتی اور بُت کی طرح چُپ ہو رہتا۔ اے قاضی! اِس کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اِس سے پوچھیے کہ سر کے درد کی کیا صورت ہے؟ اور کیسی ہے؟ اور وہ کہاں سے آتا ہے کہ اُس کی وجہ سے اس کا ناک میں دَم ہے۔ اگر یہ اپنے دردِ سر کی شکل مجھ کو دکھلا دے تو میں بھی اِس کو خُدا دِکھا دوں۔ اِس کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ "اِس نے کہا کہ جو کرتا ہے، خُدا کرتا ہے، اُس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، تو پھر اِس سے پوچھیے کہ یہ میری شکایت آپ کے پاس کیوں لایا؟ وہ تو جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ نے کیا، مجھ مجبور کا کیا قصور؟ اِس کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے، کہ اِس کا کہنا ہے کہ دوزخ کی آگ شیطان بے ایمان کو کس طرح عذاب دے گی جبکہ وہ خود آگ کا بنا ہوا ہے۔ پس! اگر یہ بات ہے تو پھر مٹّی کے ڈھیلے سے اِسے کیوں تکلیف ہوئی۔ یہ بھی تو مٹّی کا بنا ہوا ہے۔"

بُزرگ درویش کی یہ دلیلیں سُن کر قاضی بھی لاجواب ہو گیا۔

کپڑوں کی دعوت

ایک عقل مند آدمی تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ قسمت کا مارا، وہ تباہ حال قسمت آزمانے کے لیے اپنے شہر کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں آیا۔ اس نئے شہر کے لوگوں کو اس کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اُس سے کہا۔

" اے عزیزِ باتمیز! تو ایک کام کر۔ اِس شہر میں ایک بڑا دولت مند آدمی ہے۔ وہ بڑا نیک اور خُدا ترس ہے۔ شہر بھر میں اس کی سخاوت کے چرچے ہیں۔ ایسا سخی کہ حاتم طائی بھی اس پر رشک کرے۔ تو بِلا تکلّف اور بے خوف وخطر اُس کے پاس چلا جا۔ تیری تنگ دستی اُس کی دریا دِلی سے دور ہو جائے گی"۔

اُس غریب آدمی نے جب اُس امیر کی اِتنی تعریف سُنی تو بڑی اُمّیدوں کے ساتھ وہ اُس کے پاس گیا۔ لیکن جا کر کیا دیکھتا ہے کہ وہ دولت مند تو بڑا ظاہر پرست اور مغرور ہے۔ اِس بے نصیب غریب کا اُس نے ذرا بھی خیال نہ کیا۔ نہ بات پوچھی۔ نہ اُس کی بات سُنی۔ یہاں تک کہ اُسے اپنے پاس بیٹھنے تک نہ دیا۔ وہ غریب بے چارہ بہت شرمندہ ہوا اور نہایت ندامت سے کسی مسجد میں جا کر سو گیا۔ پر تھا وہ بھی بڑا دُھن کا پکّا۔ اُس نے ایک دن کیا کیا کہ، نہایت عمدہ، پاک صاف اور قیمتی کپڑے کہیں سے کرایے پر حاصل کیے اور اُنھیں پہن کر پھر اُس ظاہر پرست نو دولتیے کے یہاں گیا اور

نہایت شائستگی اور تہذیب کے ساتھ اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ امیر اب کی بار اس سے بڑے احترام اور محبت سے پیش آیا۔ اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ عمدہ عمدہ، ذائقہ دار کھانے دسترخوان پر چُنوائے۔ بے چارے غریب آدمی نے اُن خوشبودار اور خوش ذائقہ کھانوں کو کھانے کے بجائے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے کھانے کے لُقمے مُنھ میں رکھنے کے بجائے، اپنی قمیص کی آستین میں رکھنے شروع کر دیے۔ صاحبِ خانہ نے جو اُس کی یہ عجیب حرکت دیکھی تو برہم ہو کر کہنے لگا۔

"اے عزیزِ بے تمیز! اپنا لباس کھانے سے ستیاناس کیوں کرتا ہے؟ یہ کھانا، اے دانا! کھانے کے واسطے ہے، کپڑے خراب کرنے کے لیے نہیں"

امیر کی یہ بات سُن کر اُس غریب نے جواب دیا۔

"اے عزیزِ بے تمیز! میری بات غور سے سُن اور سمجھ! اُس روز میں پھٹے حالوں تیرے پاس آیا تھا تو تو نے ذرا بھی توجہ نہ کی۔ آج یہ محتاج اچھے اور پاک صاف کپڑے پہن کر تیرے قریب آکر بیٹھا تو تو نے اِس قدر تکلف کیا کہ جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ تو یہ کھانا، اے دانا! میرے لائق نہیں ہے، جس کے واسطے ہے میں اُس کو کِھلا رہا ہوں"

یہ بات سُن کر وہ نادان امیر اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا۔

اپنی قضا نہ جانی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک نجومی سے پوچھا۔

"اے ستارہ شناش! دیکھ تو ذرا میں اِس دُنیا میں کب تک زندہ رہوں گا اور کب مجھے مَوت آئے گی؟"

نجومی نے کچھ حساب لگا کر جواب دیا۔

"عالم پناہ! علمِ نجوم کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تیس برس اور جیئیں گے۔ یہ بالکل سچّی بات ہے، اِس میں ذرّہ برابر جھوٹ نہیں۔"

یہ دل شِکن بات سُن کر بادشاہ بہت ملول ہوا۔ تیس سال بعد آنے والی مَوت کے خوف نے، دو چار روز ہی میں اُسے نڈھال کر دیا۔ اِس قدر کمزور ہو گیا کہ مہینوں کا بیمار لگنے لگا۔ بادشاہ سلامت کا یہ حال دیکھ کر ایک دن وزیر نے پوچھا۔

"عالم پناہ! کئی روز سے یہ غُلام آپ کو نحیف و نزار دیکھ رہا ہے۔ آخر اِس کا سبب کیا ہے؟ اِس موروثی غُلام کو اگر کچھ معلوم ہو تو کچھ تدبیر کی جائے۔"

اپنے اِس وفادار اور نیک دل وزیر کی یہ بات سُن کر بادشاہ ملول ہو کر بولا۔

"اے وزیر صاحبِ توقیر! کچھ نہ پوچھ شعر

میں پُرغم اِس لیے بُلبل صفت دن رات نالاں ہوں
کہ باغِ دہر میں گُل کی صفت کچھ دن کا مہماں ہوں"

وزیر نے بادشاہ کی آنا کانی ایک نہ چلنے دی، اس سے مسلسل اصرار کرتا رہا کہ بادشاہ اپنی اِس حالتِ زار کی وجہ ظاہر کرے۔ آخرکار بادشاہ نے نہایت ملول اور افسردہ ہو کر کہا۔

"اے وزیرِ دل پذیر! میری زندگی کے اب صرف تیس برس باقی ہیں۔ اِسی وجہ سے اب میرا دل موت کے قریب نظر آتا ہے۔"

"خُداوندِ نعمت! آپ کو کیوں کر یقین ہوا؟" وزیر نے پوچھا۔

"فلاں نجومی نے علمِ نجوم کے حساب سے بتایا ہے۔" بادشاہ نے جواب دیا۔

وزیر یہ سُن کر بولا۔

"جہاں پناہ! اُس نجومی کو غُلام کے روبرو تو بُلوائیے ذرا، تاکہ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ وہ یہ سب کس حساب سے بتاتا ہے۔"

غرض کہ وزیر کے اصرار پر بادشاہ نے اُس نجومی کو طلب فرمایا۔ وزیر نے اُس سے پوچھا۔

"اے نجومی، جنونی! بادشاہ سلامت کی زندگی کی مُدّت تو نے ہی بتائی ہے؟"

"میں کیا کہتا ہوں! علمِ نجوم سے یہی معلوم ہوتا ہے۔" نجومی نے جواب دیا۔

نجومی کی یہ بات سُن کر وزیر نے پھر کہا۔

"تیرا بچن اگر ٹھیک ہے، تو سچ سچ بتا کہ خود تیری زندگی میں اب کتنے برس باقی ہیں؟"

وزیر کا یہ سوال سُن کر نجومی نے اُنگلیوں پر کچھ حساب شمار کر کے جواب دیا۔

"اے وزیرِ دل پذیر! اِس دُنیا میں میری زندگی ابھی دس برس اور باقی ہے۔ اِس عرصے میں اگر کوئی مجھے مارنا بھی چاہے گا تو بھی نہ مروں گا۔"

وزیر نے نجومی کی یہ بات سُنتے ہی، میان سے چمک دار تلوار نکالی اور اِس زور سے اُس کی گردن پر ماری کہ آن کی آن میں سر کٹ کر قدموں میں آگرا اور دیکھتے ہی دیکھتے نجومی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ نجومی کو یوں موت کے گھاٹ اُتار کے وزیر نے بادشاہ سلامت سے کہا۔

"دیکھیے خداوندِ نعمت! اِس کم بخت کو اپنی تو موت کا کچھ علم نہ تھا۔ پھر اُسے دوسرے کی زندگی کی مُدت کیا معلوم ہوگی۔"

یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ کر بادشاہ کی آنکھیں کُھلیں۔ اُسی دَم اُس نے اپنے دل سے ایسے سارے اندیشے نکال دیے اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگا۔

سو سُنار کی، ایک لوہار کی

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ ایک بادشاہ اپنے محل کے دریچے میں بیٹھا راہ گیروں کو آتا جاتا دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُس کی نظر دریچے کے نیچے جو پڑی تو دیکھا کہ ایک شخص ایک مُرغ اپنے ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اور بادشاہ کو دِکھا رہا ہے۔ بادشاہ نے اُس سے پوچھا۔

"اے عزیزِ بے تمیز! یہ مُرغ تو نے اپنے چُنگل میں کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

اُس آدمی نے جواب دیا۔

"جہاں پناہ! کیا بتاؤں! میں ایک مُرغ باز ہوں! مجھے مُرغوں کی پالیاں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ اِس مہینے میں میرا مُرغ کئی پالیاں ہار گیا تھا۔ اِس بات کو میں نے اپنی بد قسمتی سمجھا۔ اِس لیے میں نے آج یہ حرکت کی کہ مُرغ کو اپنے بجائے آپ کی طرف سے بازی لگا کر لڑایا، سو آپ کی بلند اقبالی کے سبب میرا مُرغ پالی جیت گیا۔ سو، عالم پناہ! بازی کی جیت کا یہ مُرغ میں آپ کے حضور لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اِس ناچیز کو قبول کیجیے۔"

بادشاہ نے بھی سوچا، جو مال مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ مثل مشہور ہے۔

"مفت کی شراب قاضی بھی پی جاتا ہے"

سو، بادشاہ نے وہ مُرغ بے تکلف اُس راہ گیر سے قبول کر لیا۔

دو چار روز بعد وہ آدمی پھر بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس بار وہ ایک بکری لے کر آیا اور بولا۔

"عالم پناہ! یہ بکری بھی میں نے آپ کے نام نیک انجام پر بازی میں جیتی ہے، اِس کو بھی باورچی خانے میں بھجوا دیجیے۔"

بادشاہ نے وہ بھی مالِ مُفت سمجھ کر لے لی۔ چند روز بعد وہ چالاک آدمی بادشاہ کے پاس پھر آیا۔ اِس بار اُس کے ہمراہ ایک کالا بھُجنگ آدمی تھا۔ اُس نے کالے آدمی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے بادشاہ سے کہا۔

"عالی جاہ! میں اِس بدخصلت آدمی سے آپ کے نام پر دو ہزار روپے کی بازی لگا کر چوسر کھیلا تھا، سو ہار گیا۔ حضور! دو ہزار روپے خزانۂ خاص سے عنایت کیجیے تاکہ غلام اِس پاجی کے چُنگل سے نجات پائے۔"

بادشاہ اُس کی یہ واہیات بات سُن کر مُسکرایا اور دل میں کہنے لگا۔

'یہ ہوتی سَو سُنار کی، ایک لوہار کی۔ یعنی آج اِس نے اچھی چوٹ دی۔'

مرتا کیا نہ کرتا، ناچار بادشاہ نے اُس کو دو ہزار روپے دِلوائے اور کہا۔

"اے عزیزِ بے تمیز! اب جو کچھ ہوا سو ہوا، گئی باتوں کا اب کیا ذکر، لیکن یاد رکھ! میرے نام پر اب کسی سے بازی نہ لگانا۔"

دوسرا باب

فریادیوں اور عادِلوں کی کہانیاں

بے ایمان قاضی

ایک شخص کچھ جواہر ایک بٹوے میں سربمہر کرکے قاضی کے پاس لے کر گیا اور بولا۔

" تو ایمان دار، سچّا اور دیانت دار آدمی ہے۔ ایک ضرورت سے میرا سفر کرنے کا اِرادہ ہے، اِس لیے میں تیرے گھر کچھ رکھنے کو لایا ہوں، اگر سفر سے میں زندہ لَوٹوں گا تو اپنی امانت لے جاؤں گا، اور اگر میری زندگی وہیں ختم ہوگئی تو اے نیک نام یہ مال تیرا ہوگا۔"

قاضی نے اُس شخص کی یہ بات سُن کر کہا۔

" اے عزیز! کوئی حرج نہیں۔"

غرض اُس نیک انسان نے وہ جواہر قاضی کے سپرد کیے اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ اِدھر قاضی نے مُہر کیا ہوا بٹوہ پھاڑ کر قیمتی جواہر نکال لیے اور اُن کی جگہ پتھّر رکھ دیے اور ایک ماہر رفوگر کو بُلا کر کہا۔

" اِس سربہ مُہر بٹوے کو ایسا رفو کردے کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہو۔ اِس کام کے لیے میں تجھے مُنھ مانگا انعام دوں گا۔"

کئی ہزار دینار اِس کام کی اُجرت ٹھہری۔ رفوگر نے اُس بٹوے کو ایسا رفو کیا کہ ہزار آنکھوں سے بغور دیکھنے کے بعد بھی عقل میں یہ بات نہ آسکے کہ اِسے

رفو کیا گیا ہے۔ رفوگر نے اِس طرح سے بٹوہ ٹھیک ٹھاک کر کے قاضی کے حوالے کر دیا اور ہاتھ کے ہاتھ اپنی پوری اُجرت لے کر روانہ ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ شخص سفر سے واپس لَوٹ آیا اور قاضی سے اپنی امانت طلب کی۔ قاضی نے سر بہ مُہر بٹوہ اُس کے حوالے کر دیا۔ گھر آکر اس نے جو بٹوا کھولا تو جواہر کی جگہ پتھّر ملے۔ اُس شخص نے جب یہ عجیب و غریب ماجرا دیکھا تو بھاگا بھاگا قاضی کے گھر آیا اور کہا۔

"اے قاضی پاجی! تو نے یہ کیا غضب کیا۔"

قاضی بولا۔

"اے عزیز! تو مجھ پر جھوٹے اور دغا باز ہونے کا کیوں الزام لگا رہا ہے۔ میں تیری امانت سے واقف نہیں ہوں۔ تو جیسا بٹوہ مجھے دے گیا تھا، ویسا ہی آکر لے گیا۔ لوگ میری دیانت سے خوب واقف ہیں۔ مجھے اگر دَولت ہی جمع کرنی ہوتی تو میں سارے شہر کا قاضی تھا، جس طرح جی چاہتا دَولت کماتا۔"

غرض کہ ایسی جھوٹی باتوں سے قاضی نے وہ قیمتی جواہر ہڑپ کر لیے۔ وہ شخص ناچار اکبر بادشاہ کے پاس گیا اور فریاد کی۔ سارا حال جاننے کے بعد اکبر بادشاہ نے **اس** شخص سے کہا۔

"اے عزیز! **تو یہ بٹوا** میرے پاس چھوڑ جا۔ چند روز بعد تو یہاں پھر آنا۔ تیری چیز مل جائے گی۔ تو بے فکر رہ۔"

بادشاہِ عالم پناہ نے اُسے تو خوش خوش رُخصت کیا، مگر جس زرنگار اور اعجوبۂ روزگار مسند پر خود بیٹھا تھا اُسے حاشیے کے قریب سے پھاڑ دیا اور سیر و شکار کے لیے پہاڑ اور خوبصورت وادیوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اِدھر یہ ہوا کہ فراش نے جو اُس مسند کو آراستہ کرنا چاہا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ قیمتی

زریں مسند حاشیے کے پاس سے کسی قدر پھٹا ہوا ہے۔ یہ عجیب و غریب واردات دیکھ کر فراش کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے حواسی کے عالم میں سوچنے لگا۔

"اگر اس مسند کے پھٹنے کا عالم پناہ کو پتہ چل گیا تو وہ مجھ کو مارے طمانچوں کے فرش کر دے گا" فراش نے اپنے ایک ساتھی کو اس احوال سے مطلع کیا تو اُس نے کہا۔

"اے بھائی! تو میری جان کے برابر ہے! اگر یہ راز میرے تیرے سوا کسی اور پر ظاہر نہیں ہوا ہے تو تو بالکل بے فکر رہ، اس شہر میں ایک بہت ماہر رفوگر ہے جو اس مسند کے پھٹے حاشیے کو نہایت خوبی اور صفا سے رفو کر دے گا۔"

پنے ساتھی سے یہ بات سُن کر فراش مسند کو رفوگر کے پاس لے گیا اور بولا۔

"اے نادرہ کار! سلیقہ شعار! تیری خدمت میں میری یہ التجا ہے تو اسے بہ خوشی قبول کر، تیری جو بھی اُجرت ہوگی، اُس سے دوگنی میں تیری خدمت میں حاضر کروں گا۔"

اُس رفوگر نے مسند کو جیسا کہ وہ تھا، ویسا ہی رفو کر دیا، اور ایسا رفو کیا کہ خود فراش کی عقل رفو چکر ہو گئی۔

قصہ مختصر! فراش نے خوش خوش اُس زرنگار مسند کو پہلے ہی کی طرح آراستہ کیا اور خاموشی اختیار کر لی، لیکن اکبر بادشاہ نے جو اُس پھٹے ہوئے مسند کو دوبارہ درست پایا تو فراش کو بلوایا اور کہا۔

"سچ سچ بتا! اس مسندِ زرّیں کو کس نادرہ کار اور سلیقہ شعار رفوگر نے

درست کیا"؟

بادشاہ کے مُنھ سے یہ الفاظ سُن کر فراش بے حواس ہوگیا اور لرزنے لگا۔

تب بادشاہ نے نہایت نرمی سے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تو بے حواس نہ ہو! یہ خوف و خطر کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ہی اِس زرنگار مسند کو مصلحتاً پھاڑا تھا"

اُس بدحواس فراش نے جب یہ بات سُنی تو اُس کے ہوش بجا ہوئے اور اُس نے رفوگر کا پتہ دیا۔ بادشاہ نے اُس نادرہ کار رفوگر کو طلب کر کے وہ بٹوہ دکھایا اور بولا۔

"اے رُو سیاہ! یہ سر بہ مُہر بٹوہ تیرے ہی ہاتھ کا درست کیا ہوا ہے؟ سچ سچ بتادے ورنہ تیرا گوشت پوست پارہ پارہ کر دوں گا"

بادشاہ کے خوف سے رفوگر نے اقرار کرلیا اور کہا۔

"واقعی اِس بٹوے میں قاضیِ شہر کے کہنے سے اس غلام نے ہی رفو کیا ہے۔ اِس بات میں بال برابر جھوٹ نہیں ہے"

تب بادشاہ نے قاضیِ شہر کو طلب فرمایا اور ارشاد کیا۔

"اے پاجی! میں نے تجھ کو دیانت دار سمجھ کر قاضیِ شہر بنایا تھا اور تو نے یہ حرکت کی؟ مگر اب اِسی میں خیریت ہے کہ اِس عزیز کو اِس کے جواہر حوالے کر دے"

بادشاہ کا یہ کلام سُن کر قاضی کہنے لگا۔

"اے بادشاہِ عالم پناہ! میں نے اِس عزیز سے جیسا سر بہ مُہر بٹوہ لے کر رکھا تھا، ویسا ہی سر بہ مُہر اِس کے سپرد کیا"

یہ پُر فریب بات سُن کر بادشاہ نے مُسکرا کر کہا۔

"اے قاضی، پاجی طینت، بے حیثیت! جس رفوگر نے اِس بٹوے پر رفو کیا ہے، وہ خود موجود ہے۔"

اِس دوبدو گفتگو سے قاضی نہایت شرمندہ ہوا۔ غرض بادشاہِ عالی جاہ نے اُس شخص کو بے ایمان قاضی سے جواہر واپس دِلوائے، اور اُس نادرہ کار اور سلیقہ شعار رفوگر کے دونوں ہاتھ کٹوا دیے، لیکن اِس کے لیے زندگی بھر کے واسطے کچھ اِتنی رقم مقرّر فرما دی کہ وہ بال بچّوں اور رِشتے داروں سمیت خوش معاش رہے اور عبادتِ جنابِ الٰہی سے غافل نہ ہو۔

مایا مِلی نہ رام

کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک بہت مال دار ساہوکار تھا۔ اُس کے پاس اِس قدر دَولت تھی کہ آسمان پر اُتنے سِتارے بھی نہ ہوں گے۔ ایک دن اُس کی بیوی نے، جو بڑی نیک اور دُور اندیش تھی، اُسے مشورہ دیا۔

"یہ دَولت ہمیشہ رہنے والی نہیں، اِس پر تو کچھ بھروسہ نہ رکھ، کیونکہ شعر

یہ دَولت کِسی کے پاس رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

اِس سے تو یہ بہتر ہے کہ کچھ اشرفیاں خاموشی سے کسی ایمان دار آدمی کے پاس رکھ دے، اِس لیے کہ ہر انسان کو زمانے کی اونچ نیچ کا سامنا کرنا ہوتا ہے، اگر خدانہ کرے کبھی اِس ناپائیدار دَولت کا دیوالہ نکل جائے تو تیری اور میری کِس طرح بسر ہوگی؟ اِس واسطے کہتی ہوں کہ اگر کچھ کہیں رکھا ہوگا تو اُس میں سے تھوڑی تھوڑی نقدی لے کر گزر اَوقات کر سکیں گے اور کِسی طرح کی پریشانی نہ ہوگی۔ کیونکہ شعر

سدا عیش دَوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

ساہوکار کو اپنی بیوی کا یہ نیک مشورہ پسند آیا، اور وہ ایک لاکھ روپے کے

برابر قیمت کی اکبر شاہی اشرفیاں ایک رات قاضیِ شہر کے پاس لے کر گیا اور بولا۔

"اے قاضیِ شہر اور دین کے رہبر! میں تجھ کو دیانت دار اور بے خیانت مرد جان کر یہ رقم تیری خدمت میں لایا ہوں۔ میری اس امانت کو تو اپنے دیانت کے صندوق میں رکھ لے، جس وقت مجھ کو کسی کام کے لیے یہ درکار ہوگی، لے جاؤں گا۔"

غرض کہ وہ ساہوکار اُن اشرفیوں کو خاموشی کے ساتھ قاضی کے پاس رکھ کر اپنے گھر آگیا۔ پھر قسمت کا کرنا یہ ہوا کہ کچھ برسوں بعد زمانے کی گردش سے اُس کا سارا مال تباہ ہوگیا اور وہ اِتنا مُفلس ہوگیا کہ دو وقت کی روٹی تک کو ترس گیا۔ آخر کار اس کی نیک بی بی نے پھر کہا۔

"اے ظلم وسِتم کے مارے انسان اور رنج وغم میں گرفتار، وہ اشرفیاں جو تُو نے قاضی کے پاس امانت رکھی تھیں، وہ کس دن کے واسطے رکھی ہیں، جا کر تھوڑی سی لے آ اور ضروری کاروبار میں خرچ کر۔"

اپنی نیک بی بی کی یہ بات سُن کر ساہوکار قاضیِ شہر کے پاس گیا اور بولا۔

"قاضی جی! میری اُس امانت میں سے ایک سَو اشرفیاں دے دیجیے، تاکہ انھیں خرچ کرکے دینوی کاموں سے فراغت پاؤں، آج کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔"

قاضی نے جو یہ بات سُنی، تو کہنے لگا۔

"اے ساہوکار! خیر تو ہے، کیسی اشرفیاں؟ یہ تو کیا بکتا ہے؟ یہ باتیں کھوٹی مار کھانے کی نشانی ہیں۔"

قاضی کی یہ دل شِکن بات سُن کر ساہوکار مایوس ہوکر، ہاتھ مَلتا، روتا اور

جی کڑھاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔
ایک روز کے بعد ساہوکار نے اس واقعے کی نواب علی مردان خاں سے شکایت کی۔ نواب صاحب نے پورے دھیان سے اس کا حال پوچھا اور اُس سے کہا۔
"دیکھو اِس بات کا تم کسی سے بھی ذکر نہ کرنا، کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تم فکر نہ کرو! انشاء اللہ ایک روز تمھاری پوری کی پوری اشرفیاں تمھارے ہاتھ آجائیں گی۔"
نواب صاحب کی یہ تسلّی آمیز بات سُن کر ساہوکار خوش خوش وہاں سے رُخصت ہوا۔ دو چار روز بعد نواب صاحب نے قاضی کو مُلاقات کے لیے اپنے گھر بُلوایا۔ اِدھر اُدھر کی چند خوش گپّیوں کے بعد نواب صاحب نے تنہائی میں بڑی راز داری کے ساتھ قاضی سے کہا۔
"اے مسندِ دین کی زینت! تیری خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ ہم لوگوں کو ہمیشہ شاہی عتاب کا خوف رہتا ہے، خُدا نخواستہ کبھی ہم سے کوئی چھوٹا بڑا قصور سرزد ہو جائے اور اُس کے بدلے میں بادشاہ ہمارا گھر بار ضبط کرلے تو پھر ہماری زندگی خُدا جانے کیونکر بسر ہوگی، اور نہیں معلوم کہ ہمارے بعد ہمارے بال بچّوں کا کیا ہوگا، اِس لیے میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ میری نو لاکھ روپے کی اشرفیاں تو اپنے پاس رکھ لے اور اپنی خاص مُہر سے یہ رُقعہ لکھ دے کہ یہ مال علی مردان خاں کے بال بچّوں کا ہے، جس وقت وہ چاہیں، لے جائیں۔"
اُس بے ایمان قاضی نے جو یہ کلام سُنا تو کہنے لگا۔
"کوئی حرج نہیں، میرا مکان حاضر ہے، جس طرح سے آپ فرما دیجیے، بجا لاؤں۔"

نواب صاحب نے فرمایا۔

"ٹھیک ہے، تواب تو جاکر ایک تہہ خانہ بنوالے، اس کے بعد اشرفیاں کسی تدبیر سے تیرے پاس پہنچا دوں گا۔"

غرض کہ وہ بے وقوف قاضی نواب کی باتوں میں آگیا اور اس نے اپنے مکان میں تہہ خانہ بنوانے کی تیاری شروع کر دی۔ جب تہہ خانہ بن گیا تو اس بے شعور قاضی نے نواب صاحب کو یہ رُقعہ لکھا۔

"آپ کے ارشادِ عالی کے بموجب مکانِ امانت اور ایوانِ دَولت تیار ہے۔ اب بے خوف و خطر آپ اپنی مصلحت پر عمل کیجیے۔"

نواب صاحب نے اِس کے جواب میں لکھا۔

"انشاء اللہ ایک دو روز بعد کسی مُبارک گھڑی میں زنانی سواریوں کے بہانے سے وہ اشرفیاں نہایت رازداری کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں گی۔ لیکن اے بندہ نواز! یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔"

اِدھر تو نواب صاحب نے یہ پُر فریب رُقعہ لکھ کر قاضی کو بھیجا اور اُدھر فریادی ساہوکار کو طلب فرما کے یوں ارشاد کیا۔

"تو کل اپنا مال اُس بداعمال سے مانگنا اور یہ کہنا کہ اگر تو میرا مال نہ دے گا تو میں علی مردان خاں کے ذریعے اِس بات کی شکایت بادشاہِ عالی جاہ تک پہنچا دوں گا۔ اِس کلام کو سُن کر وہ بے ایمان تیری اشرفیاں ضرور دے دے گا۔ اِس میں ذرا فرق نہیں۔"

غرض کہ نواب علی مردان خاں کے ارشاد کے مطابق وہ دل فگار ساہوکار قاضی پاجی کے پاس گیا، اور جو کچھ نواب نے یاد کرایا تھا، دُہرا دیا۔ قاضی اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگا۔

"اگر اِس کی ایک لاکھ روپے کی اشرفیاں واپس نہ کروں گا تو علی مردان خاں کی نو لاکھ روپے کی اشرفیاں میرے ہاتھ سے مفت جائیں گی۔ آخر کو افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔" دل میں یہ سوچ کر قاضی نے وہ ساری اشرفیاں اُس دل فگار ساہوکار کے حوالے کر دیں اور کہا۔

"خُدا کے واسطے یہ راز کسی پر ظاہر نہ کرنا، کیونکہ میں قاضی ہوں، اور یہ بڑی نازک خدمت ہے، جو میں انجام دیتا ہوں۔"

ساہوکار تو اپنی اشرفیاں لے کر چلتا بنا اور بے چارہ قاضی نواب مردان علی خاں کی نو لاکھ اشرفیوں کے انتظار میں بیٹھا رہا—— ظاہر ہے کہ وہ اشرفیاں نہ آنی تھیں، نہ آئیں۔ وہی مثل ہوئی۔

"دُبدھا میں دوؤ گئے، مایا مِلی نہ رام۔"

بے ایمان بھائی

دو بھائی تھے۔ ایک بار وہ دونوں نہایت پریشانی کی حالت میں کھانے کمانے کی غرض سے سفر پر نکلے۔ تھے بڑے قسمت والے! کچھ ہی دُور چلے تھے کہ راستے میں اُنھیں ایک بٹوہ مِلا، جس میں بہت سارے روپوں کے علاوہ دو نہایت خوبصورت اور قیمتی لعل بھی تھے۔ اُنھیں جو یوں بے محنت دولت ہاتھ آئی تو چھوٹے بھائی نے کہا۔

"اے بھائی! سفر کا مقصد تو پورا ہوگیا۔ اب آگے جانے سے کیا فائدہ! اب اپنے غریب خانے میں چل کر ہی آرام سے اَوقات بسر کریں۔ شعر

کیونکہ ایسی رقم لگی ہے ہات

جس سے اپنی کٹے گی خوش اَوقات"

بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"بات تو سچ ہے! پر مجھے سارے جہاں اور کوہ و بیاباں کی سیر کی بڑی خواہش ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اِن نینوں کا یہی بسیکھ، یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ

اے میرے پیارے بھائی! تو گھر چل، میں بھی چند روز بعد آجاؤں گا" یہ کہہ کر بڑے بھائی نے اُس مال کے برابر برابر دو حصّے کیے اور چھوٹے بھائی سے کہا۔

"اے بھائی! لے، یہ میرا حصّہ اِس لعل ایک سمیت میری بی بی کو دے دینا۔ باقی تو اپنے حصّے کا خود مالک و مختار ہے۔"

چھوٹے بھائی سے یہ گفتگو کرکے بڑا بھائی دُنیا کی سَیر کے لیے روانہ ہو گیا۔

چھوٹے بھائی نے گھر آکر بڑے بھائی کا حصّہ اپنی بھاوج کو دے تو دیا لیکن اُس کا لعل خود رکھ لیا۔

جب کچھ دنوں کے بعد بڑا بھائی سفر سے گھر لَوٹا تو اُسے اپنا لعل نظر نہیں آیا۔ اُس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"سچ بتا! وہ جو قیمتی لعل میں نے بھیجا تھا، وہ تو نے کیا کیا؟"

اُس کی بیوی کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ بولی۔

"مجھے کسی لعل کا پتہ نہیں! ہاں نقدی جو تو نے بھیجی تھی، وہ سب میرے پاس ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ لعل کس چڑیا کا نام ہے۔"

بیوی سے یہ سُنا تو پھر اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"کیوں بے ایمان! وہ قیمتی لعل تو نے کیا کیا؟"

اِس بات کے جواب میں چھوٹے بھائی نے کہا۔

"میں نے تو تیرا لعل تیری بیوی کو دے دیا تھا

ہے عجب طرح کی یہ تیری بُوجھ

مجھ سے کیا پوچھتا ہے اُس سے پُوچھ"

بڑے بھائی نے جو یہ بات سُنی تو نہایت پریشان ہو کر بولا۔

"وہ تو کہتی ہے کہ میں نہیں جانتی۔"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔

"جھوٹ بکتی ہے۔"

غرض یہ کہ اُن دونوں بھائیوں میں اِس بات پر تو تو مَیں مَیں ہونے لگی۔ جب جھگڑا زیادہ بڑھا تو بڑے بھائی کی بیوی نے قاضی سے اِس قِصّے کی داد فریاد کی۔ قاضی نے اُن دونوں کو طلب کیا اور چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"اچھا تو یہ بتا کہ جس وقت تو نے وہ بے بہا لعل اپنی بھاوج کو دیا تھا تو اُس وقت کوئی تیسرا آدمی بھی موجود تھا؟"

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔

"ہاں! دو آدمی اِس کے گواہ ہیں۔"

قاضی نے حکم دیا کہ اُن گواہوں کو حاضر کر۔ غرض یہ کہ وہ ملعون دو شخصوں کو کچھ نقد روپے دے دلا کر جھوٹی گواہی دلوانے کے لیے قاضی کے پاس لے گیا اور اُن دونوں بے دین لعینوں نے بھی جھوٹی قسم کھا کے گواہی دی۔ اُنھوں نے کہا۔

"واقعی اِس نے ایک لعل اپنی جیب سے نکال کے ہمارے سامنے اپنی بھاوج کے ہاتھ میں دیا تھا۔"

قاضی جی بھی تھے کچھ عقل کے کورے۔ بڑے بھائی سے بولے۔

"اے عزیز! تو اپنا قیمتی لعل اپنی بی بی سے لے اور اپنے بھائی کا پنڈ چھوڑ!"

بڑے بھائی کی بیوی قاضی کی زبان سے یہ بے سر و پا فیصلہ سُن کر روتی ہوئی بادشاہِ عالم پناہ کے پاس گئی اور فریاد کی۔ بادشاہِ عالی جاہ نے اُس کی فریاد سُن کر کہا۔

"تو قاضیِ شہر سے انصاف کی درخواست کیوں نہیں کرتی؟"

اُس نیک بخت نے جواب دیا۔

"عالی جاہ! قاضیِ شہر نے انصاف نہیں کیا۔"

بادشاہ نے دونوں بھائیوں اور دونوں گواہوں کو طلب کیا اور ہر ایک کو الگ الگ تھوڑا تھوڑا کافوری موم دیا اور نرمی سے کہا۔

"اچھا! تم لوگ ایسا کرو کہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر، اِس موم سے لعل کی صورت بنا کر لاؤ۔"

دونوں بھائیوں نے چونکہ لعل دیکھا تھا اِس لیے اُن دونوں نے تو لعل کی ویسی ہی صورت بنائی جیسا کہ وہ تھا، لیکن دونوں گواہوں نے کبھی لعل کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ اس لیے وہ مختلف صورت بنا کر بادشاہ کے پاس لائے۔ اِس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دونوں گواہ جھوٹے تھے لیکن یہ کیسے ثابت ہو کہ چھوٹے بھائی نے ایک لعل اپنی بھاوج کو دیا تھا یا نہیں؟ اِس لیے بادشاہ نے بڑے بھائی کی بیوی کو بھی حکم دیا کہ

"ایک لعل کی شکل تو بھی بنا کے لا۔"

اُس بے چاری نے بھی کبھی لعل کی شکل نہ دیکھی تھی، لیکن اُس نے اپنی عقل لڑائی اور سوچا لعل چونکہ بہت قیمتی ہوتا ہے اِس لیے اُس کی شکل بہت بڑی ہوتی ہوگی۔ سو وہ اپنی عقل کے مطابق ایک بڑی سی صورت بنا کر لائی، جو نہایت واہی تباہی تھی۔ اُسے دیکھ کر بادشاہ نے اپنے دل میں کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ عورت بے قصور ہے اور اس نے واقعی لعل کبھی نہیں دیکھا۔"

لعل گواہوں نے بھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ جھوٹے ثابت ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جب طمانچوں سے اُن کے گال لال کر دیے تو اُنھوں نے قبولا۔

عالی جاہ! ہم نے نقد روپے کے لالچ میں جھوٹی گواہی دی تھی۔ شعر

واجب القتل ہیں خنجر کے سزاوار ہیں ہم
ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہ گار ہیں ہم"

اور اِس طرح بادشاہ نے اپنی عقل سے کام لے کر بڑے بھائی کو چھوٹے بے ایمان بھائی سے وہ قیمتی لعل واپس دِلوا دیا۔

درخت کی گواہی

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی شخص نے سَو دینار بہ طور امانت ایک دوسرے شخص کے پاس رکھے اور خود کسی دوسرے شہر کے سفر پر نکل گیا۔ جب وہ کچھ عرصے بعد سفر سے واپس آیا اور اُس آدمی سے امانت طلب کی تو وہ مکّار کہنے لگا۔

"واہ بھئی واہ! تو میرے اوپر خوامخواہ تہمت لگا رہا ہے۔ تو تو دیوالیہ ہے، تیری اِس آنٹ سانٹ سے کچھ کام نہ چلے گا۔ چل دور ہو میرے آگے سے، نہیں تو ایسا ماروں گا کہ تیری ساری اکڑ ہی بھی پھرے گی شعر

میں نہیں واقف ترے دینار سے
سر پھرا آتا ہے عبث تکرار سے"

اُس بے چارے نے جو یہ گفتگو اُس بے ایمان کی سُنی تو ہکّا بکّا رہ گیا اور قاضیِ شہر کے پاس جا کر فریاد کی۔ قاضی نے اُس کا سارا احوال سُن کر اُس بے ایمان آدمی کو بُلوایا اور پوچھا، مگر وہ بے ایمان مُنکر ہو گیا۔ تب قاضی نے فریادی سے سوال کیا۔

"اے عزیز! تو اِس بات کا کوئی گواہ بھی رکھتا ہے یا نہیں؟"

اُس بے چارے نے جواب دیا۔

"سوائے اللہ کے اِس بات کا کوئی گواہ نہیں۔"

اب قاضی بے چارہ کیا کرتا۔ آخر کار اُس بے ایمان سے کہا۔
" اچھا قسم کھاکہ تونے اِس عزیز کے دینار نہیں لیے "
یہ سُن کر فریادی بولا۔
" اے قاضی! یہ ٹھہرا جھوٹا، اِسے قسم کھانے میں کیا شرم ہوگی۔ ایک کیا اِس کے نزدیک ہزاروں قسمیں لغو ہیں۔ شعر

قسم کا مجھے اِس کی کیا اعتبار
کہ یکتا ہے جھوٹوں میں وہ بدشعار"

فریادی کی یہ بات سُن کر قاضی نے کہا۔
" اچھا! تو یہ بتا کہ جس وقت تونے اپنی رقم اِس کے ہاتھ میں دی تھی تب یہ کہاں بیٹھا تھا؟"
فریادی نے جواب دیا۔
"جس وقت میں نے اِس بے ایمان کو اپنے سَو دینار دیے تھے تب یہ ایک کیلے کے درخت کے نیچے اکیلا بیٹھا تھا"
یہ بات سُن کر قاضی بولا۔
" تو پھر تونے یہ کیوں کہا کہ میرا کوئی گواہ نہیں۔ تیرا تو بڑا پورا اور انصاف پسند گواہ موجود ہے۔ جا اُس ہرے بھرے درخت کو لے آ، وہ تیری گواہی دے جائے گا"
قاضی سے جو یہ انوکھی بات سُنی تو وہ بے ایمان مُسکرانے لگا اور فریادی بے چارے نے پریشان ہو کر کہا۔
"اے قاضی! وہ درخت یہاں کیوں کر آئے گا؟"
قاضی نے جواب دیا۔

"میری مُہرِ خاص اُس کے پاس لے جا اور اُس سے کہنا کہ اے درختِ سرسبز! تجھ کو شہر کا قاضی طلب کرتا ہے، یہ اُس کی مُہرِ خاص میرے پاس موجود ہے۔ اِس مُہر سے مجھ کو سُرخ رو کر اور روسیاہی نہ دے۔"

خیر صاحب! بے چارہ فریادی قاضی کی مُہر لے کر اُس درخت کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد قاضی نے اُس بے ایمان آدمی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی! وہ ابھی درخت کے قریب پہنچا ہو گا یا نہیں؟ —— مجھے اور بھی ضروری معاملوں کا فیصلہ کرنا ہے۔"

قاضی کی زبان سے یہ بات سُنتے ہی وہ بے ایمان بے خیالی میں جھٹ بول پڑا۔

"ابھی دِلّی دور ہے۔ ابھی تو وہ راستے ہی میں ہو گا۔"

قاضی اُس کی یہ بات سُن کر چُپ ہو گیا۔ ایک دو گھڑی کے بعد بے چارہ فریادی بھی ناکام و نامُراد واپس آ گیا اور قاضی سے بولا۔

"اے قاضی! اُس سرسبز درخت نے تیرا حُکم مطلق نہیں سُنا۔"

قاضی نے جواب دیا۔

"اے جوانِ نادان! وہ درخت تیرے جانے کے بعد خود بخود آکر گواہی دے گیا۔"

قاضی کی یہ بات سُن کر اُس بے ایمان آدمی نے کہا۔

"واہ یہ بھی خوب رہی! میرے سامنے تو کوئی درخت نہیں آیا۔ اِتنا جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ——؟"

اِس کے جواب میں قاضی نے کہا۔

"بے شک! تو سچ کہتا ہے کہ درخت میرے قریب نہیں آیا، مگر اُس وقت

مجھ کو اُس درخت نے گواہی سے نہال کیا کہ جس وقت میں نے تجھ سے پوچھا تھا کہ ' وہ جوان درخت کے قریب پہنچا ہوگا یا نہیں '، تو نے اُس کے جواب میں کہا تھا ' ابھی وہ تو دور ہے ، ابھی تو وہ راستے ہی میں ہوگا '؛ پس اگر تو اُس درخت کی جڑ اور بُنیاد سے واقف نہ تھا تو تیری زبان سے یہ کلام کیوں کر نکلا۔ تو یوں ہی کہتا کہ ' میں کیا جانوں کہ وہ سرسبز درخت کہاں ہے ' ؟ لیکن چونکہ اِس جوان نے تجھ کو اُس درخت کے نیچے روپے دیے تھے اِسی لیے تو تیری زبان سے بے ساختہ یہ بات نکلی۔ اب مُکرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تیری اِسی میں خیریت اور عزّت ہے کہ تو بلا تکرار اِس جوان کو سَو دینار واپس کر دے نہیں تو کوڑوں کی مار سے تیرے تن بدن کی کھال اُدھیڑ ڈالوں گا۔"

آخر اُس بے ایمان نے نہایت نادم ہو کر فریادی کی امانت واپس دے دی۔

پانی کی گواہی

ایک آدمی حلوائی کی دوکان پر گیا اور اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر حلوائی کو دیا اور بولا۔

"اے حلوائی! اِس روپے کی تازہ تازہ اور عمدہ مٹھائی اندر سے لا کے دے! مگر یاد رکھنا! اگر مٹھائی اچھی نہ ہوگی تو مارے تھپڑوں کے تیرا منھ لال کردوں گا اور اِتنی جوتیاں ماروں گا کہ تیری عقل ریوڑی کے پھیر میں آجائے گی، اور جو مٹھائی پوری نہ تولے گا تو مار مار کے تیرا حلوا نکال دوں گا۔"

حلوائی نے جو اُس بے لگام کا یہ کلام سنا تو بے چارے کی سِٹّی گُم ہو گئی اور ایسا چُپ ہوا جیسے کوئی گُپ چُپ کی مٹھائی کھاتا ہے۔ کچھ دیر بعد حلوائی نے جواب دیا۔

"اے بھائی! تجھ کو اِس آب و تاب کی مٹھائی دوں گا کہ ویسی صفائی چاند سورج میں بھی نہ ہوگی۔ میری بات میں ہرگز شک نہ کرنا، میں لقندرا نہیں ہوں جو میری بات جھوٹ ہو، اور اگر تجھ کو یقین نہیں ہے تو لے، یہ ایک لڈّو کھا، دیکھ پھر کیسا جنّت کا دروازہ کھُلتا ہے۔"

غرض یہ کہ حلوائی نے اُس کے ہاتھ سے روپیہ لے کر اپنے گلّے میں رکھ لیا اور اُٹھ کر کوٹھری کے اندر گیا۔ موقع غنیمت جان کر خریدار نے حلوائی کے گلّے کے سارے پیسے اُٹھا لیے اور اپنے رومال میں باندھ لیے۔ حلوائی نے ایک روپے کی

بہت عمدہ مٹھائی ٹوکری میں لگا کر اُس کے حوالے کی۔ وہ مٹھائی لے کر فوراً وہاں سے فرار ہوگیا۔ کچھ دیر بعد حلوائی کو جو کچھ پیسوں کی ضرورت ہوئی تو کیا دیکھتا ہے کہ گلّے کے پورے کے پورے روپے پیسے غائب ہیں۔ بے چارہ اب تو بے حال ہوگیا۔ اور کہنے لگا شعر

کوئی مجھ پہ یہ کیا غضب کر گیا
کہ جس سے میں جیتے ہی جی مر گیا

پھر یکایک۔ اُسے خیال آیا کہ، ہو نہ ہو، جو شخص ابھی مٹھائی لینے آیا تھا، یہ اُسی کی حرکت ہے۔

غرض کہ بے چارہ حلوائی مثل سودائی دُکان سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے دوڑا اور ایک گلی میں اُسے جا پکڑا۔ اُس کو کھینچ کر اپنی دُکان پر لایا اور اپنا مال طلب کیا۔ خریدار نے اُس سے اِنکار کیا اور بولا۔

"اے بے وقوف! ناحق تو بھلے آدمیوں پر تہمت کا دھڑا باندھتا ہے؟ تیری یہ چکنی چکنی باتیں بے معنی ہیں، مجھ کو تیرا گلّہ لیتے کسی نے دیکھا ہے جو حق ناحق تہمت کا طوفان اُٹھا رہا ہے۔"

رفتہ رفتہ یہ قصّہ اکبر بادشاہ تک پہنچا۔ بادشاہ نے دونوں کو طلب کیا اور خریدار سے پوچھا۔ اُس نے جواب دیا۔

"حضور! یہ حلوائی، سودائی ہے۔ یہ رومال اور مال میرا ہے۔"

آخر کار اکبر بادشاہ نے مجبور ہو کر رومال مع مال اپنے توشک نہانے میں رکھوا دیا اور دونوں سے کہا۔

"اچھا! اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ، جس شخص کے روپے ہوں گے، اُس کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

وہ دونوں تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن اکبر بادشاہ سوچ میں پڑ گیا کہ عجیب قصہ ہے جس کا حل ہونا نہایت مشکل ہے، کیونکہ اس کا کوئی گواہ بھی نہیں، بقول شخصے

غیب کی بات کوئی کیا جانے

غرض یہ کہ اکبر بادشاہ نے ساری رات یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کی اور پھر صبح ہی صبح حلوائی اور خریدار دونوں کو طلب کیا اور ایک خواص کو حکم دیا۔

"جلدی سے گرم پانی کا ایک طشت حاضر کر۔"

اکبر بادشاہ کے حکم سے فوراً ہی گرم پانی کا ایک طشت حاضر کیا گیا۔ تب بادشاہ نے فرمایا۔

"اس رومال کو مع روپے پیسوں کے اس طشت میں ڈبا دو۔" رومال اور اس میں بندھے ہوئے روپے پیسوں کو سے کیا علاقہ رکھتے جو گرم پانی میں ڈبایا گیا تو ایک لمحے کے بعد ہی اکبر بادشاہ نے دیکھا کہ اس طشت کے پانی پر چکناہٹ تیرنے لگی ہے۔ بادشاہ نے اس عجیب بات کو دیکھ کر کہا۔

"واقعی، یہ روپے اس حلوائی کے ہیں، اس لیے کہ اس کے ہاتھ کی چکناہٹ جو روپے پیسوں کو لگی تھی، اُسے اس طشت کے گرم پانی نے ظاہر کر دیا ہے۔ یہ خریدار جھوٹا ہے۔ اگر روپے اس کے ہوتے تو چکناہٹ سے کیا علاقہ رکھتے۔ اصلیت یہ ہے کہ سچ، سچ ہے اور جھوٹ، جھوٹ۔"

اشرفیوں کی چوری

ایک کنجوس تھا۔ اُس نے چند اشرفیاں ایک ویران و سُنسان جنگل میں ایک درخت کے نیچے گاڑ کے چُھپا رکھی تھیں۔ کبھی کبھی وہ جنگل میں جا کر اپنی اشرفیوں کو دیکھ آتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کسی نہایت چالاک شخص نے وہاں سے اُن اشرفیوں کو اِس طرح غائب کر دیا کہ کانوں کان کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی۔

ہمیشہ کی طرح جب کنجوس جو ایک روز وہاں پہنچا تو کیا دیکھا کہ اس کی سب کی سب اشرفیاں غائب ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بہت گھبرایا پر اب پچھتائے کیا ہو جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت!

غرض وہ بے دل ہو کر روتا پیٹتا اکبر بادشاہ کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور فریادی ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اُسے طلب فرما کے پوچھا۔

"اے عزیز! تیری اِس بات کا کوئی گواہ بھی ہے یا نہیں"

اُس غم زدہ نے جواب دیا۔

"اے شہنشاہِ عادل اور اے مظلوموں کے داد رس! حقیقت تو یوں ہے کہ خُدا کے سِوا اِس کا کوئی گواہ نہیں ہے۔ مگر میں نے فلاں سُنسان اور ویران جنگل میں ایک درخت کے نیچے وہ اشرفیاں دفن کی تھیں اور کبھی کبھی جا کر

انھیں دیکھ آتا تھا، پر نہیں معلوم کہ ایسی بے نشان جگہ سے کون چالاک ـــــ ان اشرفیوں کو غائب کر لے گیا۔"

اس کی یہ بات سن کر بادشاہ نے کہا۔

"اے عزیز! کوئی بھی ایسی نامعقول حرکت کرتا ہے، جو تو نے کی ہے؟ خیر کوئی حرج نہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند ہی روز کے بعد تیری کھوئی ہوئی اشرفیاں مل جائیں گی۔"

بادشاہ نے اپنی اس پُر اُمید گفتگو سے میاں کنجوس کو تو خوش و خرّم رخصت کیا اور بڑے بڑے حکیموں کو بُلا کر کہا۔

"بھئی فلاں جنگل میں ایک بڑا عجیب درخت ہے۔ آپ لوگ اس درخت کی خوبیاں معلوم کیجیے کہ پھل، پھول اور پتّوں شاخوں سے کس کس بیماری میں فائدہ ہوتا ہے؟"

حکیموں نے بادشاہ کے حکم کے مطابق اس درخت کی خاصیتیں معلوم کیں اور بتایا۔ حضور! اُس درخت کے پتّوں کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی یرقان یعنی پیلیا کا مریض ان پتّوں کا سفوف صُبح سویرے نہار مُنھ تازہ پانی کے ساتھ کھائے تو فوراً اچھا ہو جائے۔ اس کے پھل کی یہ تاثیر ہے کہ ان کو کھانے سے تپ دق اور سل کے مریض صحت پاتے ہیں۔ اس کی شاخ کے کھانے سے تلّی کا مرض دُور ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑ استسقا کے مرض میں مفید ہے۔

جب بادشاہ نے اس درخت کی یہ خوبیاں سُنیں تو حکیموں سے کہا۔

"اچھا اب ایک کام یہ کرو کہ مجھے یاد کر کے بتاؤ کہ اس مہینے میں تمھارے دواخانوں میں کتنے مریض استسقا کے آتے تھے؟"

بادشاہ کی یہ عجیب بات سُن کر حکیموں کو پہلے تو کچھ تامّل ہوا پر انھوں نے آخر کار

اپنے اپنے مریضوں کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اُن مریضوں سے حکیموں کے سامنے ہی پوچھا۔

" سچ سچ بتاؤ کہ تم نے اِس موذی مرض سے کس دوا کے ذریعے شفا پائی۔ سچ کہنا نہیں تو سخت سزا مِلے گی "

غرض یہ کہ سارے مریضوں نے اپنی صحت کا حال بادشاہ سے بیان کیا۔ پھر جس مریض نے اُس درخت کی جڑ سے شفا پائی تھی، اُس سے بادشاہ نے پوچھا۔

" اس درخت کی جڑ تو نے کس دواساز سے منگوائی تھی۔ مجھے بھی وہ جڑ چاہیے "

بادشاہ کی یہ بات سُن کر مریض نے دواساز کو حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے دواساز سے پوچھا کہ فلاں درخت کی جڑ تو ہی لایا تھا۔ اُس بے وقوف نے جواب دیا۔

" ہاں حضور! میں اُس جڑی کی جڑ سے واقف ہوں "

تب بادشاہ یوں بولا۔

" تو اگر اُس درخت کی جڑ اور بُنیاد سے واقف ہے تو اس بے گُناہ کی اشرفیاں واپس کر دے ورنہ جوتیوں کی مار سے تیرا سر گنجا ہو جائے گا "

مار پڑنے کے ڈر سے اُس شخص نے چُرائی ہوئی اشرفیاں لاکر فوراً حاضر کر دیں۔

عقل مند حاکم

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فرشتوں کی طرح ایک نیک اور شریف آدمی تھا۔ اُسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ اُس کے پاس بہت سارا مال تھا۔ اُسی شہر میں ایک خوشبو ساز تھا، جو بڑا دغاباز تھا، لیکن اُس نیک آدمی نے سمجھا کہ خوشبو ساز بڑا ایمان دار ہے، اِس لیے وہ اپنا سارا مال خوشبو ساز کے پاس چھوڑ کر خود دوسرے شہر چلا گیا۔ جب واپس آیا اور اپنا مال خوشبو ساز سے مانگا تو خوشبو ساز بولا۔

"واہ! یہ بھی خوب رہی۔ کیا تم پاگل دیوانے ہو گئے ہو، کیسا مال؟ کیوں مجھ پر بلا وجہ الزام لگاتے ہو۔ میاں جاؤ ہوش کے ناخن لو۔ واہ بھئی واہ! تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم نے اپنا مال مجھے دیا؟ کوئی اِس بات کا گواہ بھی ہے یا یوں ہی مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔"

یہ قصہ جب پاس پڑوس کے لوگوں اور خوشبو ساز کے دوستوں نے سُنا تو اُنھوں نے بھی اُلٹا اُسی شخص کو بُرا بھلا کہا۔

"میاں تمھارا یہ الزام اِس نیک انسان کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ کیونکہ وہ شخص اپنی ایمان داری کے لیے مشہور ہے۔ اِس کے پاس خود بہت سامال ہے۔ تم بھی میاں چاند پر خاک ڈالنے چلے ہو۔ تم خواہ مخواہ اِس سے جھگڑا کرو گے تو اپنے کیے کی سزا پاؤ گے۔"

یہ باتیں سُن کر وہ بے چارہ چُپ ہو رہا۔ لیکن دو روز کے بعد وہ حاکمِ شہر کے پاس فریاد لے کر گیا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ حاکم نے پوچھا۔

"تمھارے پاس اِس کا کوئی ثبوت ہے؟ تم نے خوشبو ساز سے مال دیتے وقت کچھ لکھا پڑھی بھی کی تھی یا نہیں؟"

اُس بے چارے نے جواب دیا۔

"حضور! خُدا کی ذات کے سِوا کوئی اِس بات کا گواہ نہیں۔"

حاکم نے اس کی بات سُن کر کہا۔

"اچھا ایک کام کرو۔ تم تین روز تک اُس کی دوکان پر جاکر بیٹھو۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولنا۔ تیسرے دن میری سواری اُدھر سے گُزرے گی۔ میں تم کو سلام کروں گا، تم کہنا "وعلیکم السّلام" اور چُپ ہو رہنا۔ پھر میں تم سے کچھ کہوں گا، پر کوئی جواب نہ دینا مگر اپنے سر کو بِلا خوف ذرا سا ہلا دینا۔ میرے جانے کے بعد تم اُس سے اپنے مال کے بارے میں بات کرنا۔ اس کا جو بھی وہ جواب دے میرے پاس آکر کہنا۔"

حاکمِ شہر یہ ترکیب اسے سمجھا کر اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ اُدھر وہ شخص حاکم کے کہنے کے مطابق خوشبو ساز کی دوکان پر آبیٹھا، پر مال کا کوئی ذکر نہ کیا۔ تیسرے روز حاکمِ شہر کی سواری اُدھر آئی۔ جس وقت حاکمِ شہر اُس شخص کے قریب آیا تو اپنا گھوڑا روکا اور اُس آدمی کو سلام کیا۔ اُس آدمی نے جواب میں "وعلیکم السّلام" کہا اور خاموش ہو گیا۔ پھر حاکم یوں بولا۔

"کیا بات ہے بھئی! تم کبھی کبھار بھی میرے پاس نہیں آتے، نہ اپنا کچھ حال مجھ پر ظاہر کرتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" حاکم کے اِس سوال کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا، بس ذرا سا سر ہلا دیا اور حاکمِ شہر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ حاکم

کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ آدمی خوشبو ساز سے بولا۔

"کیوں بھائی ہمارا مال نہ دو گے ؟ تمھاری یہی مرضی ہے، خیر اچھا، مگر اس کا نتیجہ بُرا ہے۔ مثل مشہور ہے

'جو ستائے گا کسی کو وہ ستایا جائے گا"

خوشبو ساز نے جو یہ بات سُنی تو دل میں کہنے لگا "یہ تو حاکمِ شہر کا یارِ غار ہے۔ اگر اس نے حاکم سے اِس بات کا ذکر کر دیا تو ناحق میری عزّت کو بٹّہ لگے گا اور مال دینا پڑے گا وہ الگ، اِس سے تو بہتر ہے کہ عقل سے کام لوں اور شرمندہ ہونے سے بچوں" یہ سب سوچ بچار نے کے بعد اُس نے کہا۔

"اچھا میاں یہ تو بتاؤ! جس وقت تم نے اپنا مال مجھے دیا تھا تو اُس وقت میرے قریب کوئی اور شخص بھی تھا یا یہ معاملہ میرے اور تمھارے ہی درمیان پیش آیا تھا ؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو شاید میں ہی بھول گیا ہوں"

الغرض اُس آدمی نے جب پورا واقعہ پھر بتایا تو وہ دغا باز خوشبو ساز یوں بولا۔

"ہاں! تم سچ کہتے ہو! مجھ کو بھی اب یاد آگیا۔ لو یہ رہا تمھارا مال! لے جاؤ"

ایک کے بدلے دو

ایک شخص نے ایک ہزار روپے ایک صرّاف کو بطورِ امانت رکھنے کے لیے دیے۔ وہ بے چارا سمجھا تھا کہ صرّاف دیانت دار ہے اور اُس کی امانت میں خیانت نہ کرے گا۔ خیر صاحب وہ روپے صرّاف کے حوالے کرکے ایک ضروری کام سے کسی دوسرے شہر کے سفر پر نکل گیا۔ بہت دن بعد جب وہ واپس آیا اور صرّاف سے اپنے ایک ہزار روپے طلب کیے تو وہ بددیانت اور دغاباز صرّاف مُکر گیا اور بولا۔
"واہ بھئی واہ! تو ایسی کھوٹی باتوں سے میری دیانت میں بٹّہ لگانا چاہتا ہے، چل دور ہو میرے آگے سے، نہیں تو ایسا ٹھوکوں گا کہ تیری جان تن سے نکل جائے گی اور جوتیوں کی مار سے تیری چندیا گنجی ہو جائے گی! تجھ سے نیارے اور بہروپیے میں نے بہت پرکھ ڈالے ہیں! بس جا تیری یہ جھوٹی آنٹ سانٹ تجھے کچھ فائدہ نہ پہنچائے گی"
صرّاف کی یہ بات سُن کر وہ شخص بے چارہ جل بُھن کر افسوس سے ہاتھ مَلتا ہوا شہر کے قاضی کے پاس گیا اور فریاد کی۔
"اے قاضیِ شہر! میں تیری عدالت میں انصاف کا طالب ہوں۔ شعر

جو انصاف اِس کا نہ ہم پائیں گے
تو جھوٹوں سے سچے نہ بر آئیں گے"

غرض یہ کہ قاضی نے اُس غریب کا سارا حال بہ غور سُننے کے بعد کہا۔

"اے عزیز! اب تو یہ بات ہرگز کسی سے نہ کہنا! جا، دو چار روز کے بعد تیرے روپے اُس کی بے دیانتی کی تھیلی سے نکل آئیں گے"۔ غرض، قاضی نے اُسے خوب تشفّی اور تسلّی دے کر رُخصت کیا اور اُس بے ایمان صرّاف کو تنہائی میں بُلوا کر کہا۔

"بھائی میری نظر میں تو مردِ دیانت دار ہے اور سارے ساہوکاروں کے سر کا تاج ہے! میں تیری شرافت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ میں نے تجھے اِس وقت اِس لیے تکلیف دی ہے کہ حضور پُرنور بادشاہ سلامت کی خدمت کے بدلے میرا عہدہ اور رُتبہ بڑھنے والا ہے، مگر میرا کوئی ایسا ساتھی اور مہربان نہیں ہے جسے میں اپنا شریکِ حال کر کے اپنا نائب بناؤں! سو میں نے طے کیا ہے کہ تجھے ہی اپنا نائب بناؤں کیونکہ میری نظر میں تجھ سا دیانت دار اور لائق کوئی دوسرا شخص نہیں"۔ اُس بے دُم کے گدھے نے جو قاضی کے مُنہ سے یہ خوش خبری سُنی تو وہ مارے خوشی کے واقعیٔ گدھے کی طرح پھُول گیا۔ اور بے اختیار ہنس کر کہنے لگا۔

"بہت خوب! سرکار آپ بھی دیکھیں گے کہ میں اپنی خدمت کس خوبی سے انجام دیتا ہوں"۔ قاضی نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اِس میں کیا شک ہے!"

غرض یہ کہ اُس بے وقوف کو قاضی نے سبز باغ دِکھا کر رُخصت کیا اور اُس فریادی کو بُلوا کر کہا۔

"جا اب اُس صرّاف کے پاس جا کر بے جھجک اپنے روپے مانگ! اُس سے کہنا کہ اے بدکردار ناہنجار! اگر تو میرے روپے نہیں دیتا ہے تو چل میرا اور تیرا انصاف قاضی کے سامنے ہوگا۔ یہ سُن کر وہ دغاباز

بلا تکرار تیرے روپے دے دے گا۔"

وہ آدمی صرّاف کے پاس گیا اور قاضی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک ہزار روپے طلب کیے۔ وہ بے ایمان شیطان یہ سُن کر دل میں سوچنے لگا کہ اگر اب سے دوبدو گفتگو کروں گا یا اس کے ساتھ قاضی کے پاس جاؤں گا تو نائب کا عہدہ مُفت ہاتھ سے جائے گا۔ اِس سے تو بہتر یہ ہے کہ اس کے روپے اِس طرح دے دوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا۔

"اے عزیز باتمیز! تو خاطر جمع رکھ! کل جو میں نے اپنا کھاتا دیکھا تو تیرے روپے مجھے بھی یاد آگئے۔ سو تیرے وہ ایک ہزار روپے یہ حاضر ہیں، لے جا، مگر قسم کھا کے مجھ سے یہ وعدہ کر کہ یہ راز تو کسی پر ظاہر نہ کرے گا، تو ایک ہزار کیا میں تجھے دو ہزار روپے دوں گا۔" کہاں تو وہ بے چارہ اپنے ایک ہزار روپے کو رو بیٹھا تھا نہ یہ کہ اب دو ہزار ملتے ہیں! کسی نے خوب کہا ہے۔

'چپڑی اور دو دو'

غرض کہ اس بے ایمان صرّاف نے جو کہا تھا، وہی کیا۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وقت پڑے تو اپنی غرض کے لیے گدھے کو بھی لوگ باپ بنا لیتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ وہ آدمی صرّاف سے دو ہزار روپے لے کر قاضی کے جان اور مال کو دُعائیں دیتا ہوا اپنے گھر سدھارا اور یہ دوسرے دن قاضی کا نائب بننے کے لالچ میں اُس نیک نام قاضی کے پاس پہنچا۔ قاضی نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی! ابھی تو میرے کام میں دیر ہے، جب وقت آئے گا تو
میں خود سواری بھیج کر تمھیں بلوالوں گا۔" قاضی کی زبان سے جو یہ بات
سُنی تو وہ نہایت ملول ہو کر اپنے گھر آیا اور دِل میں سخت شرمندہ
ہو کر کہنے لگا۔
"ہائے! قاضی کا نائب بننے کے لالچ میں دو ہزار روپے مُفت ہاتھ
سے گئے۔"

آقا اور غُلام

ایک بار یوں ہوا کہ ایک دغا باز اور نافرمان غُلام اپنے نہایت شریف اور نیک طینت آقا کے پاس سے بھاگ گیا۔

چند روز کے بعد آقا کِسی کام سے گھومتا گھامتا ایک دوسرے شہر میں پہنچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا نالائق غُلام مزے سے اِس شہر میں سیر سپاٹے کرتا پھر رہا ہے۔ آقا نے اپنے غُلام کو پہچان لیا اور لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ غُلام، تھا بڑا چالاک، اِس سے پہلے کہ بے چارہ آقا مُنہ سے کچھ کہتا، جھٹ سے غُلام نے یہ حرکت کی کہ آقا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کَس کر پکڑ لیا اور اُلٹا بولا۔

"اے غُلام ناکام! کِتنی مدّت اور کِتنے لمبے عرصے کے بعد آج تو میرے ہاتھ آیا ہے۔ سچ سچ بتا میرا مال جو تو چُرا کر بھاگا، وہ تو نے کہاں غارت کیا؟"

آقا، غُلام کی یہ حرکت دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ غرض کہ دونوں میں خوب تو تو میں میں ہونے لگی۔

آقا کہتا۔

"تو میرا زر خرید غُلام ہے۔"

غلام کہتا۔
نہیں! تو میرے باپ کا غلام ہے، خدا سے ڈر۔ تیری تو وہ مثل ہے۔
—— اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"
غلام کی اِس ڈِھٹائی اور سینہ زوری کی وجہ سے بے چارے آقا پر تو یہ مثل صادق ہو گئی کہ
—— سچّا جھوٹے کے آگے رو رو مرے۔
آخرکار آقا اپنا یہ مقدمہ حضرت امیرالمومنین کے حضور میں لے گیا اور انصاف کا طلب گار ہوا۔ حضرت امیرالمومنین نے یہ عجیب و غریب قِصّہ سُن کر دونوں سے فرمایا۔
"اچھّا! اگر تمھارا کوئی گواہ نہیں ہے، تو تم دونوں الگ الگ دریچوں میں سر نکال کر بیٹھو، تمھارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔"
حضرت امیرالمومنین کے حُکم کے مُطابق آقا اور غُلام دونوں، دو الگ الگ دریچوں میں سر باہر نکال کر بیٹھ گئے۔ تب جنابِ امیرالمومنین نے جلّاد کو حُکم فرمایا۔
"اے جلّاد! دیکھتا کیا ہے؟ غُلام کی گردن پر ایسی تلوار مار کر اُس کا سر اُڑ جائے۔" یہ ہولناک فیصلہ سُن کر سچ مچ کے غُلام نے جھٹ سے اپنا سر دریچے کے اندر کھینچ لیا اور آقا جس طرح بیٹھا تھا، بیٹھا رہا۔ ذرا ٹس سے مَس نہ ہوا۔ اسی کو کہتے ہیں۔
—— سانچ کو آنچ کیا۔

حضرت امیرالمومنین نے غُلام کی یہ حرکت دیکھ کر آقا سے ارشاد فرمایا۔

"اے عزیز! سچ یہ ہے کہ یہ شخص تیرا غُلام ہے، اور تو اس کا آقا ہے۔ جا اِسے لے جا، اور جو چاہے سو کر، پر اِس بے وفا اور مکّار سے وفا کی ہرگز اُمّید نہ رکھ۔"

گوشت کی شرط

دو آدمیوں نے چوسر کھیلتے ہوئے آپس میں یہ بازی لگائی کہ ہم میں سے جو شخص جیتے گا وہ ہارنے والے کے بدن سے کھال سمیت ایک سیر گوشت کاٹ لے گا۔

آخرکار بازی ختم ہوئی اور اُن میں سے ایک شخص ہار گیا جیتنے والے نے اُس سے کہا۔

"لاؤ! اپنے بدن کا ایک سیر گوشت دو۔"

بے چارہ ہارنے والا بہت گھبرایا۔ اُس نے بہت منّت سماجت اور خوشامد کی کہ جیتنے والا اس کے بدن کا گوشت نہ کاٹے، اُس کے بدلے جتنے چاہے روپے پیسے اور قیمتی سے قیمتی تحفے لے لے، پر جیتنے والا تو اس وقت جیت کے نشے میں شیر ہو رہا تھا، نہ مانا اور بولا "میں تو کھال سمیت تمھارے بدن کا ایک سیر گوشت ہی لوں گا۔"

بھلا ہارنے والا اچھا بھلا اپنے بدن کا گوشت کیوں کر کٹوا دیتا۔ اس بات پر دونوں میں خوب تکرار ہوئی، یہاں تک کہ یہ مقدمہ انصاف کے لیے قاضی شہر کے سامنے پیش ہوا۔ قاضی نے بازی

جیتنے والے کو بہتیرا سمجھایا اور کہا۔

"اے قصائی صفت انسان! تو اس غریب کمزور تن کے بدن کے گوشت کا طلب گار نہ ہو۔ اپنے اِس بےہودہ اور وحشیانہ مطالبے سے باز آجا۔ تجھے جتنے روپے پیسے درکار ہوں، اس غریب سے لے لے اور اِسے اِس طرح کی تکلیف نہ دے۔" وہ جیت کے نشے میں مست انسان، قاضی جی کے سمجھانے بُجھانے پر بھی راضی نہ ہوا تو مجبور ہو کر قاضی نے کہا۔

"اے عزیز! اگر تو نہیں مانتا اور یہی تیری مرضی ہے کہ تو اس کے بدن کا گوشت ہی لے گا تو خیر۔ بسم اللہ! بے دھڑک کاٹ لے، پر ایک بات کا خیال رہے کہ اگر اس کے بدن سے کاٹا ہوا گوشت تولنے میں ایک سیر سے ایک ماشہ بھی کم یا زیادہ نکلا تو پھر تیری خیر نہیں۔ تیری بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کوّوں کے حوالے کر دوں گا۔"

قاضی جی کی یہ کڑی شرط سُن کر بازی جیتنے والا پریشان ہو گیا۔ گھبرا کر بولا "اے قاضی! میں اس بات پر راضی، میرا خدا راضی کہ میں نے اِس شخص کا گوشت کھال سمیت معاف کیا ـــــ اب مجھے اس سے کچھ نہیں چاہیے۔

اصلی ماں

دو عورتیں ایک خوب صورت بچّے کے لیے آپس میں جھگڑا کر رہی تھیں۔ وہ دونوں بچّے کو اپنی طرف کھینچتیں اور ایک دوسرے سے کہتیں۔

"یہ میرا بیٹا ہے۔ تو کون ہوتی ہے، جو میرے بچّے کو زبردستی لیتی ہے۔"

اُس وقت وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو دونوں کا جھگڑا چُکاتا۔ سو، یہ عجیب و غریب ماجرا حضرت امیرالمومنینؓ کے حضور میں پیش ہوا اور دونوں ماؤں نے انصاف چاہا۔ یہ عجیب قِصّہ جب حضرت امیرالمومنین نے سُنا تو ایک جلاّد بے درد کو حُکم دیا۔ "تلوار سے اِس بچّے کے دو ٹکڑے کر دو۔ اور اِن دونوں عورتوں کو برابر برابر دو حِصّے دے دو۔ آدھا اِسے اور آدھا اُسے۔"

حضرت امیرالمومنین کی زبان مُبارک سے یہ عجیب و غریب فیصلہ سُن کر اُن میں سے ایک عورت تو خاموش ہوگئی لیکن دوسری عورت بے چین ہو کر زار زار رونے لگی اور بولی۔

"اے جنابِ پاک! ایسا غضب نہ کیجیے۔ میں اِس بات پر خوش

ہوں اور حق تعالیٰ کا شُکر بجالاتی ہوں کہ یہ معصوم اور بے گُناہ بچّہ آپ اِس مردود ہی کو دے دیجیے۔ خُدارا بچّے کے قتل کا حُکم نہ فرمائیے۔"

اِس پُر درد اور نیک و رحم دِل عورت کی یہ آہ و بکا سُن کر حضرت امیرالمومنین نے تسلّی اور تشفّی دیتے ہوئے فرمایا۔

"اے نیک سیرت بی بی! سچ یہ ہے کہ یہ بچّہ تیرا ہی ہے، تو ہی اِس کی اصل ماں ہے۔ یہاں کوئی اندھیر نہیں ہے کہ کوئی سیاہ بخت اور سنگدل اسے تجھ سے چھینے۔"

غرض اِس دانائی کے ساتھ انصاف فرما کر حضرت امیرالمومنین نے وہ پیارا پیارا بچّہ اُس کی ماں کو دِلوادیا، اور اُس جھوٹی مکّار عورت کو جو بچّے کے قتل کے حُکم پر بھی خاموش رہی تھی، جھوٹا قرار دے کر نہایت سخت سزا دی۔

روئی کی چوری

پُرانے زمانے کا ایک مشہور قصّہ ہے کہ کسی شہر کے بازار سے روئی کے کچھ گٹھّے چوری ہو گئے۔ چوروں کی تلاش میں کوتوال نے بُہتیرا سر مارا، پر کسی طور پر کامیاب نہ ہوا۔ آخر کار سب روئی فروش بادشاہ کے پاس فریاد لے کر گئے۔ بادشاہ بڑا رحم دل اور منصف مزاج تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر اِن فریادیوں کی چوری گئی ہوئی روئی نہ ملے گی تو میں اِن سے آنکھ نہ مِلا سکوں گا۔ سو بادشاہ نے اپنے دربار کے ہر ایک امیر کو حُکم دیا کہ چوروں کی تلاش کی ذِمّہ داری سب پر ہے۔

بادشاہ سلامت کا حُکم سُن کر ایک امیر نے یہ تدبیر کی کہ شہر کے سارے مردوں کو اپنے گھر دعوت کے بہانے بُلوایا۔ جب شہر کے سب لوگ اُس کے یہاں جمع ہو گئے، تب اُس نے بلند آواز سے کہا۔

''اِس شہر کے لوگ بھی عجیب بے وقوف ہیں۔ خوب اچھّی طرح جانتے ہیں کہ روئی کے گٹھّے چاندنی چوک سے چوری ہو گئے ہیں، اور بادشاہ سلامت اُن کی تلاش میں نہایت سرگرم ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی آپ میں سے بعض لوگ میرے گھر روئی کے روئیں اپنی داڑھیوں اور چہروں پر چھوڑ کر آئے ہیں۔''

اِس صاحبِ تدبیر امیر کی یہ انوکھی بات سُن کر بعض لوگ سچ مُچ اپنی داڑھی مونچھیں جھاڑنے لگے۔ یہ ماجرا دیکھ کر امیر نے پھر کہا۔

"یہی لوگ روئی کے چور ہیں۔ اِن کی داڑھیاں نوچ ڈالو۔"

غرض کہ اِن چوروں کی خوب پٹائی ہوئی، لیکن وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ ہم پر یہ جھوٹا الزام ہے۔ ہم چور نہیں ہیں۔ مگر مار وہ چیز ہے کہ 'لکڑی کے بَل مکڑی ناچے'۔ آخرکار جب اُن کی خوب اچھّی طرح دُھنائی ہوئی تو اُنھوں نے چوری قبول کر لی اور چُرائی ہوئی روئی واپس کر دی۔

انصاف کی چھڑی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی امیر آدمی کے دیوان خانے سے کچھ قیمتی سامان چوری ہو گیا۔ بہت تلاش کرنے کے باوجود بھی نہ مِلا تو یہ مُقدمہ قاضیِ شہر کے سامنے پیش ہوا۔ قاضی جی گھر کے اندر گئے اور کئی چھڑیاں برابر برابر تراش کر باہر لے آئے اور بولے۔

"اِن میں سے ایک ایک چھڑی ہر خادم، نوکر اور صاحبِ خانہ اپنے اپنے گھر لے جائے اور صُبح تڑکے میرے پاس اپنی اپنی چھڑی واپس لے آئے۔ اِن میں سے ہر ایک چھڑی کی یہ خاصیت ہے کہ چور کے پاس ایک اُنگلی کے برابر خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ جو چور نہیں ہوتا اُس کی چھڑی اُتنی کی اُتنی رہتی ہے۔ ذرا بھی نہیں بڑھتی۔ اِس طریقے سے میں چور اور بے گناہ کو پہچان لیتا ہوں۔ اِس عمل سے میں نے کئی دفعہ چوروں کو پکڑا ہے۔"

قاضی جی کی یہ بات سُن کر سب لوگوں نے ایک ایک چھڑی اُٹھالی اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اُن میں سے وہ شخص، جو سچ مچ چور تھا، اپنے گھر پہنچا تو اس نے دِل میں سوچا "اگر میری یہ چھڑی ایک اُنگلی کے برابر زیادہ نِکلے گی تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ ناحق میری

چوری ظاہر ہو جائے گی۔ اِس لیے اِس کم بخت چوری فاش کر دینے
والی چھڑی کو ایک اُنگلی برابر تراش دوں تو خوب ہو۔"
اپنی اِس چالاکی پر خوش ہو کر میاں چور نے جھٹ چھڑی کو چھُری
سے ایک اُنگلی کے برابر کاٹ ڈالا، اور نہایت اطمینان سے خوش
خوش لمبی تان کر سو گئے۔ جب صبح ہوئی تو وہ اپنی چھڑی لے کر خوشی
خوشی اور بے خوف و خطر قاضی کے گھر گیا۔ سارے لوگ جمع ہو چکے
تھے۔ قاضی جی نے باری باری تمام چھڑیوں کو ناپا۔ اس شخص کی چھڑی
ایک اُنگلی کے برابر چھوٹی نکلی۔
اس ترکیب سے قاضی نے چور کو پکڑ لیا اور سب کے سامنے
خوب رُسوا کیا اور اتنے جوتے لگوائے کہ وہ قایل ہو گیا اور آنکھ چُرا
کر بولا۔
"بس حضور! اب آپ دوستوں میں مجھے اور زیادہ رُسوا نہ کریں۔
میں امیر صاحب کا سارا مال و اسباب بے چوں چرا لا کر حاضر کرتا ہوں۔

شرط کی شرط

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ دو آدمیوں نے کچھ نقد مال ایک نیک اور ایماندار بڑھیا کے سپُرد کیا اور کہا۔

"دیکھو بڑی بی! جس وقت ہم دونوں مل کر تمھارے پاس آئیں، تبھی تم ہمارا مال لوٹانا۔ نہیں تو نہیں۔" یہ کہہ کر وہ دونوں چلے گئے۔

پھر یوں ہوا کہ کچھ دن بعد اُن میں سے ایک آدمی بُڑھیا کے پاس آیا اور بولا۔

"خدا کی قسم، میرا ساتھی مرگیا ہے، اِس لیے تو وہ مال اب مجھے دے دے۔" یہ ایسی بات تھی، جسے سُن کر بُڑھیا نے سارا مال اُس آدمی کے حوالے کر دیا۔

لیکن چند ہی دن بعد اُن میں کا دوسرا آدمی اُس بُڑھیا کے پاس آیا اور بولا۔

"بڑی بی! وہ ہماری امانت ہم کو دے دو تاکہ ہم اپنے کاروبار میں خرچ کریں۔" یہ حیرت انگیز بات سُن کر بڑھیا نے نہایت ملال کے ساتھ جواب دیا۔

"اے بیٹا! تیرا دوسرا بھائی تیری موت ظاہر کرکے سارا مال لے گیا۔

یہ بھی قسمت کی کھوٹ تھی میری
یوں تو مقروض اب ہوئی تیری

اُس آدمی نے بڑھیا کی ایک نہ سُنی اور سارا قصّہ قاضی جی سے جاکر کہا اور انصاف کا طلب گار ہوا۔ قاضی نے پورا حال سُننے کے بعد دل میں سوچا۔"بہ ظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ بُڑھیا بے قصور ہے"۔ اسی خیال کے آتے ہی قاضی نے اسی ملعون سے کہا۔

"اچھا بھائی! یہ بتا تو نے بُڑھیا سے پہلے یہی شرط کی تھی نہ کہ جس وقت ہم دونوں شریک مال تیرے پاس آئیں، تو ہی اپنا مال واپس لے جائیں۔ سو اب تو جا اور اپنے شریک مال کو ساتھ لے کر آ اور بہ خوشی اپنا سارا مال لے جا، تجھ اکیلے کو اس بُڑھیا سے ایک پیسہ بھی نہ ملے گا۔

قاضی کی یہ بات سُن کر وہ شخص لاجواب ہو گیا۔

تیسرا باب

بے وقوفوں کی کہانیاں

فلسفی نوکر

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص اپنے بہت پیارے اور تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر کسی شہر کی سرائے میں آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کا نوکر بھی تھا۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر سوتے وقت مالک نے اپنے نوکر سے کہا۔

"اے عزیز ناچیز! سننے میں آیا ہے کہ اس شہر کے چور بڑے بے درد اور چوری کرنے میں نہایت دلیر ہیں۔ سو تو ایک کام کر۔ تو شوق سے پاؤں پھیلا کر سوجا، میں اپنے اس قیمتی اور تیز رفتار گھوڑے کی خود نگرانی کروں گا۔"

اپنے آقا کی یہ بات سن کر نوکر نے جواب دیا۔

"اے میرے مالک! یہ تو نہایت بے ہودہ بات ہو گی کہ آقا تو تمام رات جاگے اور دو پیسے کا نوکر ساری رات آرام سے سوئے۔ نہ صاحب! یہ نہیں ہو گا۔ آپ اطمینان سے آرام فرمائیے، اور آپ کا یہ ناچیز نوکر ساری رات جاگ کر گھوڑے کی نگرانی اور پاسبانی کرے گا۔ گھوڑے کی طرف سے آپ اطمینان رکھیے۔"

نوکر کی یہ بات سن کر مالک کو اطمینان ہوا اور وہ آرام سے سو گیا۔

ایک پہر رات کے بعد آقا کی آنکھ کُھلی تو اُس نے نوکر سے پوچھا۔
"کیوں بھئی! کیا کر رہے ہو؟"
"میرے مالک!" نوکر نے جواب دیتے ہوئے کہا "اس وقت یہ
یہ غلام سوچ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پانی پر کیوں کر ٹھہرا رکھا
ہے؟"
نوکر کا یہ عجیب جواب سُن کر مالک نے کہا۔
"اے بے خبر! مجھے ڈر ہے کہ تو یوں ہی واہی تباہی باتیں سوچتا رہا
تو تیری اِس بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر چور، ہمارا مال اسباب نہ
چُرا لے جائیں۔"
نوکر نے جواب دیا۔
"اجی اُن کی کیا مجال ہے۔ آپ بے فکر رہیے اور اطمینان سے سو جائیے
آقا بے چارہ یہ تسلّی آمیز بات سُن کر پھر سو گیا۔ آدھی رات کے بعد پھر اُس
کی آنکھ کُھلی اور پوچھا۔
"اے باخبر! اب کس فکر میں ہے؟"
نوکر نے جواب دیا۔
"اے خداوند! اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے یہ لمبا
چوڑا اور بے کنار آسمان بغیر ستونوں کے کس طرح کھڑا کر رکھا ہے اور کیل
گاڑنے میں زمین کی مٹّی کہاں غائب ہو جاتی ہے؟"
نوکر کی یہ واہیات بات سُن کر آقا نے کہا۔
"اے بے خبر! تیری اس بے خبری سے مجھے خوف ہے کہ کوئی میرا گھوڑا
اُڑا کر نہ لے جائے۔ اچھّا! ایک کام کر، اگر تیرا جی سونے کو چاہے تو سو جا۔"

نوکر نے پھر وہی جواب دیا۔

"خداوندِ نعمت ! آپ اطمینان رکھیے ! میں پوری طرح خبردار اور ہوشیار ہوں۔" مالک بے چارہ پھر سو گیا۔ تین پہر رات کے بعد پھر اچانک اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ پھر اُس نے پوچھا۔

"کیوں بھئی ! کیا خبر ہے ؟"

اِس بار نوکر نے جواب دیا۔

"خداوندِ نعمت ! اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اُونٹ کے پیٹ میں گولیاں کون باندھتا ہے اور کیلے کے پتّوں پر خود بہ خود اِستری کِس طرح ہو جاتی ہے ؟"

غرض کہ مالک بے چارہ پھر نوکر کی باتوں میں آکر بے فکری سے سو گیا، اور جب چار گھڑی شب باقی تھی تو ایک بار اُس کی آنکھ پھر کھُلی۔ اُس نے نوکر سے اب کے پوچھا۔

"کیوں بھئی ! اب کیا خبر ہے ؟"

نوکر نے جواب دیا۔

خداوند نعمت ! بعض چور بھی بہت دانش مند اور اپنے کام میں بڑے ماہر ہوتے ہیں کتنی عجیب بات ہے کہ ایسا ہی کوئی مُنہ روز چور سُرنگ لگا کر گھوڑا لے اُڑا۔

مالک نے بڑی بے بس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کیا کہا ؟ چور گھوڑا لے اُڑا ؟ پھر تم یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو ؟

نوکر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

خداوند نعمت ! آپ کا یہ غلام ناکام اس فکر میں ہے کہ گھوڑا چوری ہو جانے

کے بعد اس کی زین اور نمگیر آپ کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا یا مجھ کو اپنے سر پر لاد کر لے چلنا ہو گا۔"

یہ وحشت اثر خبر سُن کر آقا کے ہوش اُڑ گئے۔ اُس نے اس بے وقوف نوکر کو بہت سخت سُست سُنائیں۔ گھوڑا چوری جانے کا اُسے بے حد افسوس ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ 'جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت'۔

چار بے وقوف اور ایک بُڑھیا

ایک تھی بُڑھیا۔ نیک سیرت اور خوب صورت۔ ایک بار وہ کسی کام سے بازار گئی۔ اسے اتفاق ہی کہیے کہ اس نے سر کھجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ اسی وقت وہاں سے چار آدمی گزر رہے تھے۔ اُنھوں نے بُڑھیا کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا تو اُن میں سے ایک بول اُٹھا۔

"اس نیک بی بی نے بغیر مُنہ سے بولے مجھے سلام کیا ہے"۔

یہ سُن کر دوسرا بولا

"اے بے حیثیت! تجھ میں ایسی کیا خوبی ہے۔ جو بڑی بی تجھے سلام کرے گی۔ اُس نے تو مجھے سلام کیا تھا"۔

تیسرے اور چوتھے آدمی نے بھی یہی کہا کہ بڑی بی نے اُنھیں سلام کیا ہے۔ غرض کہ اتنی سی بات پر اُن چاروں میں تکرار ہونے لگی۔ بات اِتنی بڑھی کہ وہاں بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ہجوم میں سے ایک عقل مند آدمی نے کہا۔

"اے دوستو! تم بے بات آپس میں جھگڑتے ہو۔ وہ بُڑھیا ابھی آگے جا رہی ہو گی، جا کر، اُسی سے پوچھ لو کہ اُس نے تم میں سے کِسے سلام کیا تھا۔ ذرا سی بات کو بیکار اِتنا بڑھا رہے ہو"۔

یہ معقول بات سن کر وہ چاروں نا معقول دوڑے اور اُس غریب بُڑھیا کے قریب پہنچے اور یوں کہنے لگے۔

"اے بڑی بی صاحب! ہم چاروں میں سے تم نے کس ناکام کو سلام کیا تھا؟" یہ بے ہودہ بات سُن کر بُڑھیا دل میں سوچنے لگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ چاروں شخص بالکل بے وقوف ہیں۔ اُس نے مُسکرا کر اُن سے کہا۔

"اے میاں! تم چاروں میں سے جو زیادہ بے وقوف ہوگا" اُسی کو میں نے سلام کیا ہے۔

پہلے بے وقوف کی کہانی:

بڑی بی کی یہ بات سن کر اُن میں سے ایک بے وقوف بولا۔

"بڑی بی! میری تو بے وقوفی یہ ہے کہ میں ایک بار اپنی سُسرال گیا۔ وہاں لوگوں نے کھانے کے وقت مجھ سے کہا 'کچھ کھا پی لو' پھر اطمینان سے آرام کرو' مجھ قسمت کے مارے کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ میں تو اپنے گھر سے کھانا کھا کے آیا ہوں۔ بے چاروں نے بہت خوشامد کی' کہ تھوڑا بہت کھا پی لوں' پر میں راضی نہ ہوا' اِس لیے کہ بے وقوفی سے پہلے انکار کر چُکا تھا' اور اب اپنی اس حماقت کو نبھانا بھی تھا۔ غرض کہ بے چارے سب چُپ ہو رہے' اور میں بھوکا ہی سو گیا۔ تھوڑی ہی رات گزری تھی کہ میری آنکھ کُھل گئی' بہت زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اب جو میری شامت آئی تو میں نے یہ انوکھی حرکت کی کہ بھیس بدلا اور چُپکے سے دروازہ کھول بھیک مانگنے

کے ارادے سے باہر نکل گیا۔ اب دیکھیے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر ٹکڑے مانگتا مانگتا اپنی ہی سُسرال کے دروازے پر آ پہنچا اور بھیک کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ اندر سے ایک ملازمہ، کہ جس کا نام چنبیلی تھا، روٹی کا ٹکڑا لے کر باہر نکلی۔ میں نے جو اُسے پہچانا کہ یہ تو ہماری ہی نوکرانی ہے اور یہ دروازہ بھی اپنی ہی سُسرال کا ہے، تو وہاں سے میں نے پچھلے پاؤں ہٹنا شروع کیا۔ وہ نوکرانی بھی روٹی دینے کے لیے برابر آگے بڑھتی رہی۔ جُوں جُوں میں پیچھے ہٹتا جاتا تھا، وہ آگے بڑھی چلی آتی تھی اور یہ کہتی تھی۔

"لے فقیر! تو روٹی کا ٹکڑا کیوں نہیں لیتا؟"

اب قسمت کا کرنا یہ ہوا کہ میں پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک کنوئیں کے کنارے آگیا اور دھڑام سے کنوئیں میں گر پڑا۔ میرے کنوئیں کے اندر گرتے ہی شور مچ گیا کہ کوئی غریب اور قسمت کا مارا فقیر، کنوئیں میں گر پڑا ہے۔

آخر کار لوگوں نے نہایت محنت کے بعد مجھ باولی صُورت کو کنوئیں کے اندر سے نکالا اور سبھوں نے پہچان لیا کہ یہ تو فلاں کا داماد ہے۔ ارے! اس کی یہ کیا کم بختی تھی، جو یہ اس پُرملامت حالت میں گرفتار ہوا۔

غرض کہ اس ذِلت اور ندامت کی وجہ سے آج کے دِن تک میں نے پھر کبھی سُسرال کا نہ نام لیا اور نہ کبھی اُدھر کا رُخ لیا۔ سو بڑی بی! یہ تھی میری بے وقوفی، جو میں نے بیان کی۔ بڑی بی نے یہ قصّہ سُن کر کہا۔

"بہت خوب! آفریں! مرحبا۔!"

دوسرے بے وقوف کی کہانی:

اِس اُلّو کی یہ بات سُن کر دوسرا لٹورا بول اُٹھا۔

"بڑی بی صاحب! اب میری حماقت کی لاجواب حکایت دِل لگا کر سُنیے۔ ایک مرتبہ کا ذِکر ہے کہ سُسرال سے میرا بُلاوا آیا۔ قاعدہ ہے کہ داماد جب سُسرال جاتا ہے تو سر پر پگڑی باندھ کر جاتا ہے، اِس خاکسار کو پگڑی باندھنی آتی نہ تھی، سو میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور اُن کی منّت سماجت اور خوشامد کر کے سر پر پگڑی بندھوائی۔ گھر آکر عُمدہ عُمدہ کپڑے پہنے اور سُسرال کی طرف روانہ ہو گیا۔ سُسرال بڑی دُور تھی، چلتے چلتے تھک گیا اور نیند آنے لگی، ایسے میں سوچا کہ کسی ایسی جگہ پر سونا چاہیے کہ سر سے پگڑی نہ اُتارنی پڑے۔ اتّفاق سے اِس خاکسار کو قریب ہی میں ایک پُختہ کنواں نظر آیا۔ میں لپک کر کنویں پر پہنچا اور وہاں اِس ترکیب سے سویا کہ سر تو کنویں کے اندر کی طرف رکھا، اور اُس کے چبوترے پر پاؤں پھیلا دیے۔ اور اس طرح خوب گہری نیند سو گیا۔ اس طرح سوتے میں جو کروٹ لی تو پگڑی کنویں میں گِر گئی۔ سوتے سوتے بہت دیر ہو گئی، سہ پہر کے بعد جو اس غُلام کی آنکھ کُھلی تو بہت گھبرایا کہ دِن تو بہت تھوڑا باقی رہ گیا ہے، اور جانا ابھی بہت دُور ہے۔

غرض کہ اس گھبراہٹ میں مجھے پگڑی کی بھی کچھ خبر نہ رہی، اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگم بھاگ جو میں سُسرال کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں کی ایک مُلازمہ چلی آ رہی ہے۔ اُس نے جو دیکھا کہ میاں ننگے سر بدحواس بھاگے چلے آ رہے ہیں تو اُس نے سوچا کہ شاید بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ بے ہودہ بات سوچ کر مُلازمہ اُلٹے پاؤں روتی ہوئی گھر میں گئی اور یہ عجیب ماجرا میری ساس سے بیان کیا۔ سُنتے ہی گھر کے

سب لوگوں کی حالت غیر ہوگئی اور سب کے سب افسوس کرتے جلتے اورزار زار روتے جلتے۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہوا۔ میں انجانے میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ گھر کے سارے لوگ بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ سب کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی زار زار رونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رونے کی اِن دِلدوز آوازوں کو سُن کر پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے۔ اُنھوں نے ہر ایک رونے والے کو تسلّی دی اور پھر مجھ سے پوچھا۔

"میاں یہ واقعہ کیوں کر ہوا؟"

میں نے روتے روتے، غم سے نڈھال ہوکر، اُنھیں سے پوچھا۔

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ میاں! تم ہی بتاؤ کہ یہ ماجرا کیوں کیسے پیش ایا؟"

آخر کار ہوا یہ کہ سارے عزیزوں، رشتے داروں اور پڑوسیوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ رونا دھونا فضول ہی ہے۔

"اے بڑی بی! یہ تھی میری زور دار حماقت۔ وہ دِن کا دِن، کہ آج تک میں بدنصیب پھر کبھی سُسرال نہیں گیا۔

بُڑھیا نے یہ قصّہ سُن کر دوسرے بے وقوف سے بھی کہا۔

"خوب! آفریں! مرحبا!"

تیسرے بے وقوف کی کہانی:

جب یہ دوسرا اُلّو بھی اپنی لاثانی کہانی بیان کر چکا تو تیسرا مسخرا یوں بولا۔

"بڑی بی صاحب! یہ غلام بھی ایک بار جب اپنی سُسرال پہنچا

تو وہاں خوش دامن صاحبہ نے اس خاکسار کے لیے عُمدہ عُمدہ کھانے تیار کر والئے، اور جب مجھ سے کھانے کو کہا تو اتّفاق سے میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"اس وقت میرا پیٹ خوب بھرا ہے۔ بالکل بُھوک نہیں"۔

گھر کے سارے لوگوں نے بُہتیری خوشامد کی، پر میرے مُنہ سے چونکہ ایک بار انکار نکل گیا تھا اس لیے پھر مطلق میں کھانے کے لیے راضی نہ ہوا۔ بہ قول شخصے۔

'جائے لاکھ رہے ساکھ'۔

آخر کار سارے رشتے دار ناچار ہو کر چُپ ہو گئے اور میں یوں ہی بھُوکا سو گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں مارے بُھوک کے آنکھ کُھل گئی، اور پھر ساری رات نیند نہ آئی۔ جب میری بیوی سو گئی تو میں نے اُٹھ کر آس پاس کھانے کی تلاش کی۔ پر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اچانک ایک چھینکے میں کوری ہانڈی نظر آئی۔ بندے نے لپک کر جو اُسے کھولا تو مُرغی کا انڈا ہاتھ لگا۔ اُسی لمحے یکایک میری بی بی کی آنکھ کُھل گئی تو میں نے رُسوائی اور ندامت کے ڈر سے مُرغی کا وہ انڈا جھٹ مُنہ میں رکھ لیا اور جھپٹ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ مجھے اس عجیب و غریب حالت میں دیکھ کر میری بی بی پوچھنے لگی۔

"اے میاں! خیر تو ہے! کیا بات ہے جو اس طرح گھبرا کے لیٹ گئے"۔

اُس نیک بخت نے ہزار سر مارا مگر میں نے جواب نہ دیا۔ جواب دیتا بھی کیوں کر۔ بندے کے مُنہ میں انڈا جو تھا۔ کس مُنہ سے جواب

دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غریب گھبرا گئی اور سارے گھر کے لوگوں کو وہاں اکٹھا کر لیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر ہر ایک یہی کہتا کہ اسے کوئی بیماری ہو گئی ہے، یا پھر کوئی بلا اس پر چڑھ گئی ہے۔ غرض کہ گھر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ آخر کار ایک بڑا سیانا جرّاح بلوایا گیا۔ اس نے غور سے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"اس کے گال پر ورم ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اندر مواد پک گیا ہے۔ نشتر کے سوا اب کوئی چیز فائدہ نہ کرے گی۔"

قصّہ مختصر یہ کہ جرّاح نے سب سے اجازت لے کر خاکسار کے اُس پھولے ہوئے گال پر جونہی نشتر لگایا، فوراً ہی میں نے وہ انڈا اس گال سے دوسرے گال میں رکھ لیا۔ یہ حیرت انگیز بات دیکھ کر جرّاح نے کہا۔

"دیکھیے صاحب! اِدھر کا مواد اب اُدھر چلا گیا ہے۔"

اب جرّاح نے میرے دوسرے گال کو بھی چاک کر ڈالا تو وہ انڈا اس بندے کے مُنہ سے نکل پڑا۔ گھر والے اس انڈے کو دیکھ کر بہت گڑگڑائے۔ اُس دن سے آج تک پھر کبھی یہ خاکسار سُسرال نہیں گیا۔ شعر

کہو اب منصفی سے تم بڑی بی
کہ مجھ سا دیکھا ہے احمق کہیں بھی؟"

چوتھے بے وقوف کی کہانی:

جب تیسرا بے وقوف اپنی حماقت کی کہانی بیان کر چکا تو چوتھا

بے وقوف بولا۔

"بڑی بی صاحب! اس خاکسار کا قصہ یوں ہے کہ ایک صاحبِ توقیر امیر نے مجھ پر بھروسہ کرکے اپنے کسی علاقے میں کام کاج کی دیکھ بھال کے لیے بھیجا۔ وہاں پہنچ کر بندے نے وہ اُدھم مچایا کہ مالک کی ساری آمدنی بے ہودہ باتوں میں خرچ کرنے لگا اور کبھی ایک پیسہ مالک کو نہ بھیجا۔ زندگی خوب نشتم پشتم گزر رہی تھی۔ اس عالم میں غلام کو یہ سُوجھی کہ اب شادی کر لینی چاہیے۔ یہ احوال سُن کر قانون گو اور دیگر لوگوں نے کہا۔

"آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں؟"

یہاں تو بندے کے سر پہ حماقت سوار تھی۔ کسی کا کہنا نہ مانا۔ آخر کار ایک مکّار بُڑھیا کو بُلوا کر اُس سے کہا وہ کہیں میری شادی پکّی کروا دے۔ بُڑھیا نے یہ اندازہ کرتے ہوئے کہ یہ خاکسار نہایت بے وقوف ہے' کہا۔

"بہت بہتر"

یہ کہہ کر وہ مکّار بُڑھیا اپنے گھر چلی گئی۔ ایک دن کے بعد آئی ' اور کہنے لگی۔ "میاں صاحب! میں نے آپ کی شادی' ایک صاحبزادی سے ٹھہرا دی ہے۔ پانچ چھ روز میں آپ کی اُس نیک بخت سے شادی ہو جائے گی' لیکن پانچ سو روپے چڑھاوے کے لیے عنایت کیجیے تو آپ کی بات اُس کے ساتھ پکّی کر آؤں۔

بندے نے فوراً پانچ سو روپے اُس کے حوالے کر دیے۔ چند روز بعد وہ پھر آئی' اور بولی "میاں صاحب! شادی کی تیاری اور سامان وغیرہ خریدنے کے لیے دو ہزار روپے اور دیجیے۔"

خاکسار نے فوراً ہی دو ہزار روپے اور اُس کو دلوا دیے۔
دو چار روز کے بعد آ کر اس نے کہا۔
"میاں صاحب! تم جو باقاعدہ برات لے جا کر بیاہنے چڑھو گے تو آتش بازی اور ناچ اور راگ رنگ میں بلاوجہ بہت خرچہ ہو جائے گا، اُس سے تو بہتر ہے کہ سادگی کے ساتھ صرف نکاح پڑھوا لیجیے۔ مثل ہے۔
'آم کھانے سے کام یا پیڑ گننے سے'۔
اُس کی ان باتوں سے بندہ یہ سمجھا کہ یہ بوڑھی عورت نہایت نیک ہے اور میرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہی ہے، لیکن یہ نہ سمجھا۔
'کہ ہیں اس بھلے میں بُرے طور بھی۔
— آخرکار اُس کی اس بات سے خوش ہو کر میں نے اُسی کو سارا اختیار دیا اور اُس سے بولا۔
"اے بی بی

جو چاہے کرے تو سفید و سیاہ
ولے مجھ کو ہر طرح کرنا ہے بیاہ"

اس کے جواب میں وہ مکار بڑھیا بولی۔
"خیر! اچھا۔ مگر نکاح کے ضروری اخراجات کے واسطے کچھ عنایت کیجیے تو کام شروع کیا جائے"
بندے نے دو ہزار روپے اور دے دیے۔ اُس کے چند دن بعد وہ پھر آئی اور کہنے لگی۔
"میاں صاحب! بات یہ ہے کہ ابھی آپ کی دلہن کے آنے کا شگون نہیں ہے۔ جب شگون ٹھیک ہوگا تو کسی مبارک گھڑی میں تمھاری دلہن

آئے گی اور تمھارے گھر، در و دیوار کو روشن کر دے گی لیکن تب تک کے لیے ضروری اخراجات اور ضروری رسومات کے واسطے کچھ دلوائیے۔ بندی کی بھی دو چار مہینے کچھ گزر بسر ہو جائے گی۔"

غرض یہ کہ اس خاکسار نے مزید دو ہزار روپے اس چالاک بڑھیا کو اور دے دیے۔

اب جو چند روز کے بعد وہ آئی، تو یہ خوش خبری سنائی۔

"میاں صاحب! مبارک ہو۔ تمھارے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ کچھ چھٹی چلّے کے واسطے بھی دلوائیے۔"

اس سادہ لوح نے کچھ روپے اور اسے دے دیے۔

حاصل کلام یہ کہ وہ یوں ہی اکثر آتی اور کبھی لڑکوں کی ٹوپی کُرتے، کبھی کھانے پینے اور کبھی کپڑوں کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتی۔ اور اس طرح وہ لاکھوں روپے لے گئی، اور جب کبھی میں نے سوال کیا کہ ذرا میری بی بی کو تو دکھا دے تو وہ یہی کہہ کر ٹال جاتی کہ

"میاں صاحب! ابھی تک دن کڑوے کسیلے ہیں۔"

اس عرصے میں یہ الگ ہوا کہ میری حماقت کی دُور دُور خبر پھیل گئی یہاں تک کہ میرے نانا کو بھی اس کی خبر ہو گئی۔ اُدھر اُس کے پاس میری طرف سے ایک کوڑی بھی نہیں پہنچی تو اُس نے مجھے ناکارہ سمجھ کر میرے پاس تبادلے کا حکم بھیج دیا۔ اس بات سے میں بڑا مایوس ہوا۔ اس حالت یاس میں مجھے اپنے لڑکے بالوں کا خیال آیا اور جی چاہا کہ کسی طرح اپنی بی بی کے پاس پہنچ جاؤں! میں اسی فکر میں تھا کہ وہ مکّار بڑھیا آئی۔ میں نے اُس سے کہا۔

"بڑی بی! تمھاری بڑی عُمر ہے۔ میرے یاد کرتے ہی تم آگئیں۔ اے بڑی بی صاحبہ! ہمارے کام میں تو خلل آگیا۔ لیکن اب اگر تم ہمارے گھر والوں کو ہمیں دِکھلا دو تو ہمارے روز روز کے تقاضوں سے نجات پاجاؤ۔"

میری یہ بات سُن کر وہ مکّارہ بولی۔

"بہت خوب! کچھ روپے لڑکوں کی مٹھائی کے لیے منگوائیے۔ میں آپ کی مُراد ابھی پوری کرتی ہوں۔"

غرض کہ وہ دغاباز مجھ کو ایک بھلے آدمی کے مکان کے دروازے پر لے گئی اور بولی۔

"میاں صاحب! تمھاری سُسرال یہی ہے۔ اب یہاں دستک دیجیے۔ تمھارے صاحب زادے نکل آئیں گے۔ دو چار گھڑی تم ڈیوڑھی میں بیٹھنا، جب تمھارا سالا دربار سے آئے گا تو تم کو گھر کے اندر لے جائے گا۔ کل سے آپ کی بی بی مجھ سے خفا ہیں، نہیں تو میں ہی آپ کو لے چلتی۔"

یہ واہیات بات کہہ کر وہ بدذات تو وہاں سے فرار ہو گئی اور بندے نے دروازے پر ایک دستک جو دی تو پانچ چھ برس کے چھوٹے چھوٹے لڑکے اندر سے نکل آئے۔ میں نے مٹھائی دے کر اُن سے کہا۔

"لو بیٹا! کھاؤ! دل میں کچھ شک نہ کرنا۔"

غرض کہ وہ لڑکے مٹھائی کا دونا گھر کے اندر لے کر گئے تو گھر والوں نے سمجھا کہ میاں کا کوئی یار غار آیا ہے جو لڑکوں کے لیے مٹھائی لایا ہے۔ یہ سمجھ کر گھر والی نے اندر سے پان دان اور عطر دان بھجوا دیا۔ کچھ دیر بعد

نہایت ذائقہ دار اور عُمدہ کھانا بھیجا اور کہلوایا۔

"وہ تو خدا جانے کب دربار سے آئیں، آپ بلا تکلّف کھانا کھائیے"۔

قصّہ مختصر کہ اِس خاکسار نے کھانا زہر مار کیا اور لڑکوں کو لیے ڈیوڑھی میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد صاحب خانہ بھی آ گئے۔ مجھ سے صاحب سلامت کی اور گھر میں جا کر بی بی سے پوچھا۔

"اے بی بی! یہ اجنبی مرد ڈیوڑھی میں کیوں بیٹھا ہے؟"

بی بی نے جواب دیا۔

"میں کیا جانوں یہ کون بلا ہے؟ میں تو سمجھی تھی کہ تمھارا کوئی رشتے دار ہے یا کوئی تمھارا لنگوٹیا دوست ہے، جو یوں لڑکوں کے لیے مٹھائی لے کر آیا ہے"۔

یہ عجیب و غریب بات سُن کر صاحب خانہ باہر آیا اور مجھ سے بولا۔

"اے حضرت! آپ اِس وقت کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"اے بھائی!" اِس خاکسار سادہ لوح نے سادگی سے جواب دیا۔ "ہیں! تم مجھے نہیں پہچانتے؟ میں تمھارا رشتے کا بھائی ہوں۔ تمھاری بہن میری بیوی ہیں، اور میرے یہ دونوں لڑکے تمھارے بھانجے ہیں"۔

میری یہ بے ہودہ بات سُن کر صاحب خانہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"اے گدھے یہ کیا بکتا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔ نہیں تو مار مار کے انجر پنجر ڈھیلے کر دوں گا۔ خیر میں تو کچھ نہیں کہتا، لیکن دوسری جگہ ضرور مار کھائے گا"۔ غرض کہ صاحب خانہ نے نہایت ذلیل کر کے اپنے گھر سے بندے کو نکالا۔ سو، اے بڑی بی۔ آج تک مجھے اس واقعے کی ندامت اور خجالت ہے۔

غرض چاروں کی بے وقوفیوں کی کہانی سُن کر بڑی بی نے اُنھیں شاباشی دی اور کہا۔

"سچ تو یوں ہے کہ، تم سب کے سب احمق ہو۔ اور میں نے جو سلام کیا تھا، تو اے بندہ نواز میرا سلام قبول کیجیے۔"

بڑی بی نے چاروں سے کہا اور وہاں سے رُخصت ہو گئی۔

بھلا آدمی

ایک تھے مرزا جیون شاہ جہاں آبادی۔ رہتے تھے لکھنؤ میں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اپنے مکان کے کوٹھے پر بیٹھے چوسر کھیل رہے تھے۔ اتفاقاً اُس دن مکان میں گنّے کی گنڈیریوں اور نارنگیوں کے بہت سے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر مرزا جیون کے ایک بے تکلّف دوست نے کہا۔

"مرزا جی! آپ جیسے پاک صاف اور صفائی پسند شخص کے گھر میں یہ گندگی حیرت کی بات ہے"۔

مرزا جی کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ فوراً اپنے نوکر کو بُلا کر کہا۔

"ارے یہ کوڑا کچرا جھاڑ کر کوٹھے کے نیچے پھینک دے، لیکن ذرا بھلے آدمی کو دیکھ بھال کر پھینکنا"۔

"بہت بہتر صاحب"۔ نوکر نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر نوکر نے سارا کوڑا کچرا جھاڑ جھوڑ کر ایک ٹوکرے میں بھرا اور کوٹھے کے ایک کنارے پر آکر بیٹھ گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کوٹھے کے نیچے سڑک پر کوئی بھلا آدمی آئے تو ٹوکرے میں بھرا ہوا کوڑا کچرا پھینکے، کیونکہ میاں صاحب نے کہا ہے کہ بھلے آدمی کو دیکھ

کر پھینکنا۔ اتّفاق یوں ہوا کہ ذرا دیر بعد ایک نہایت شریف آدمی، دُھلے دُھلائے پاک صاف کپڑے پہنے اُدھر سے جو گزرے تو نوکر نے جھٹ سے وہ ٹوکرا اُن کے اُوپر پھینک دیا۔ بے چارے آفت کے مارے راہ گیر کو بڑا غُصّہ آیا اور غضب ناک ہو کر بولا۔

"ابے او مسخرے! تو اندھا ہے جو بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھینکتا ہے؟"

راہ گیر کی یہ بات سُن کر وہ بے وقوف بولا۔

"بڑے صاحب! میں کیا کروں، مرزا صاحب کے کہنے سے پھینکا تھا" تمھاری تو وہ مثل ہے کہ

'دُھوبی سے جیتتے نہیں، گدھے کے کان مروڑتے ہو'۔

نوکر کی یہ واہیات بات سُن کر راہ گیر کو اور زیادہ غُصّہ آیا۔ تڑخ کر بولا۔

"ابے تیرا کون سا مرزا ہے۔ بُلا تو سہی۔ کیا وہ ایسا سنکی پاگل ہے کہ بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھکواتا ہے"۔

یہ سُنتے ہی اُس بے وقوف نوکر نے ہانک لگائی۔

"مرزا صاحب! ذرا اِدھر آئیے۔ آپ کو کوئی بھلا آدمی بُلا رہا ہے"۔

مرزا جی دوڑے دوڑے آئے۔ آکر کیا دیکھتے ہیں کہ کوٹھے کے نیچے سڑک پر ایک نہایت شریف آدمی کھڑا ہے اور غُصّے سے لال پیلا ہو رہا ہے۔ گنڈیری کے دو چار چھلکے اُس کے سر پر پڑے ہیں۔ راہ گیر نے جو مرزا جی کو دیکھا تو تڑخ کر بولا۔

"او مرد آدمی! یہ کون سی آدمیت اور شرافت ہے کہ بھلے آدمیوں پر کوڑا کچرا پھکواتا ہے؟"

راہ گیر کی یہ بات سُن کر مرزا جی نے بے وقوف نوکر سے ڈپٹ کر کہا۔
"لے مسخرے! میں نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ یہ کوڑا کچرا کسی شریف آدمی کے مُنہ پر پھینکنا؟"
نوکر جھٹ بولا۔
"میاں! تم نے نہ کہا تھا کہ بھلے آدمی کو دیکھ کر پھینکنا، سو اِن سے بھلا آدمی کون ہو گا؟"
راہ گیر یہ بات سُن کر نوکر کی بے وقوفی کو بھانپ گیا مُسکراتے ہوئے بولا۔
"خیر معلوم ہوا"
مرزا جی نے ہاتھ جوڑ کر راہ گیر سے کہا۔
"حضرت سلامت! آپ اس وقت مجھ غُلام ناکام کو جو چاہے سو کہہ لیجیے، اِس لیے کہ یہ بے وقوف عقل سے معذور ہے۔ اِس کا کوئی قصور نہیں۔ قصور میرا ہی ہے۔"
مرزا جی کی یہ معافی تلافی سُن کر بے چارہ وہ بھلا آدمی اپنے گھر چلا گیا۔

یک نہ شُد، دو شُد

ایک دن کیا ہوا کہ ایک سائیس اپنے رئیس کا گھوڑا نہلانے کے لیے دریا پر لے گیا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ گھوڑے کا پاؤں بھنور کنڈ میں جا پڑا اور وہ بے اختیار غوطے کھانے لگا۔ سائیس نے جیسے تیسے اپنے آپ کو تو بچا لیا، لیکن گھوڑا دریا میں ڈوب گیا۔

اِس ناگہاں حادثے کی وجہ سے سائیس پریشاں حال دوڑتا ہوا اپنے آقا کے پاس آیا اور بولا۔

"میاں صاحب! آپ کا گھوڑا دریا میں فرار ہو گیا"۔

یہ بُری خبر سُن کر آقا بے تابی سے اُٹھا اور نوکر سے کہا۔

"اے بے وقوف! چل میری تلوار اُٹھا، دیکھوں تو سہی تو نے میرا گھوڑا کیوں کر ڈبو دیا"۔

غرض کہ آقا بے چارہ سائیس کے ہمراہ دریا کے کنارے پہنچا اور پوچھا۔

"اے احمق! بتا تو سہی تو نے میرا وہ تیز رفتار گھوڑا کہاں ڈبویا؟"۔

یہ بات سُنتے ہی اُس بے وقوف نے تیزی سے تلوار دریا میں پھینک کر کہا۔

"میاں صاحب! دیکھیے اُس جگہ آپ کا گھوڑا ڈوبا ہے"۔

رئیس نے جو سائیس کی یہ حرکت دیکھی تو بے اختیار ہو کر بولا۔
"خوب! ایک نہ شُد، دو شُد۔ پہلے تو میرا پیارا گھوڑا ڈبویا اور اب تلوار بھی بے وقوفی کی لہر میں ڈبو دی۔ اے نالائق! کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے جو تو نے کیا۔ بس اب مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ تو نِرا احمق ہے۔ چل دُور ہٹ میرے سامنے سے۔"
آخر کار رئیس نے اِس بے وقوف سائیس کو نوکری سے برطرف کر دیا۔

بیوہ بیوی

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ ایک آدمی جو بہت بھولا بھالا اور بے وقوف تھا، اپنے گھر سے بہت دُور کہیں نوکری پر گیا۔ کئی دن بعد کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اُس کی بیوی اپنے گھر کے دالان میں بیٹھی مُنہ دھو رہی تھی۔ اُس نے اُس وقت ناک سے نتھ اُتار لی تھی۔ اُدھر سے ایک نائن کا گزر ہوا۔ نائن نے جو دیکھا کہ بی بی کی ناک بے نتھ ہے تو اُس نے اپنی عقل کے مُطابق دِل میں سوچا کہ شاید ہماری بی بی خدانخواستہ بیوہ ہوگئی ہیں، جو ناک میں نتھ نظر نہیں آتی۔ یہ سوچتی سوچتی وہ اپنے گھر آئی اور اپنے نائی شوہر سے بولی۔

"تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے، جلد خبر لے، فلاں بی بی بیوہ ہوگئی۔"

یہ خبر سُنتے ہی میاں نائی فوراً اپنے گھر سے روانہ ہو گئے، اور چلتے چلتے پہنچے اُس جگہ جہاں وہ بھولے بھالے صاحب مُلازم تھے۔ نائی نے اُس سے کہا۔

"اے میاں صاحب! یہاں کس فِکر میں بیٹھے ہو۔ وہ تمھاری بی بی بیوہ ہوگئی۔"

میاں صاحب نے جو یہ غم ناک بات سُنی تو بے اختیار ڈاڑھیں مار مار

کر رونے لگے اور بیوی کے بیوہ ہونے پر افسوس کرنے لگے۔
آس پاس کے لوگوں نے جو یہ عجیب ماجرا دیکھا اور سُنا تو بولے۔
"اے بے وقوف! ذہن سے خالی! کہیں بھی سُنا ہے کہ میاں زندہ رہے اور بیوی بیوہ ہو جائے۔"
سب کی یہ بات سُن کر اُس نے روتے روتے جواب دیا۔
"بھائی! تم لوگ کہتے تو سچ ہو۔ پر کیا کروں! گھر سے معتبر نائی آیا ہے اور یہ وحشت اثر خبر لایا ہے۔ میرا تو حال تباہ ہو رہا ہے۔"
اُس کی یہ بات سُن کر سارے لوگ قہقہہ مار کے ہنسنے لگے۔

داڑھی میں آگ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی قصبے میں ایک قاضی جی رہا کرتے تھے۔
تھے تو وہ قاضی ہی، لیکن بہت بے وقوف تھے۔
ایک دفعہ وہ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کتاب میں اُنھوں نے یہ لکھا دیکھا کہ جس شخص کا سر چھوٹا ہو اور داڑھی بے اندازہ بڑی ہو تو وہ شخص بالکل بے وقوف ہوتا ہے۔
یہ بات پڑھ کر قاضی جی خود کے بارے میں غور کرنے لگے۔
اتفاق سے یہ دونوں باتیں خود قاضی جی میں موجود تھیں۔
ان کا سر چھوٹا تھا اور داڑھی بہت لمبی! کتاب میں یہ بات پڑھ کر اُنھوں نے سوچا۔ چھوٹے سر کو تو میں بڑا نہیں کرسکتا البتہ داڑھی کو کم کرنا تو اپنے بس کی بات ہے۔ یہ سوچ کر اُنھوں نے قینچی تلاش کی لیکن اُس وقت کہیں بھی قینچی اُن کے ہاتھ نہ آئی۔ آخرکار ناچار ہو کر آدھی داڑھی ہاتھ میں پکڑ کر چراغ کی لَو کے سامنے کر دی، فوراً داڑھی نے آگ پکڑ لی اور جب آگ قاضی جی کے ہاتھ تک پہنچی تو بے اختیار ہاتھ سے داڑھی چھوڑ دی۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی جی کی پوری داڑھی جل گئی اور اُن کی صورت

بھُنتی ہوئی بسری کی سی ہوگئی ۔ غرض یہ کہ قاضی جی کو اپنی اِس نادانی پر بے حد شرمندگی ہوئی ۔ اُنھوں نے دل ہی دل کہا۔

"کتاب کی بات آخر سچ ثابت ہوئی اور داڑھی کے جل جانے سے اپنی بے وقوفی سامنے آگئی ۔"

حماقت کا بوجھ

ایک تھا بے وقوف! وہ ایک گھوڑی پر بیٹھا کہیں جا رہا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اُس نے اپنے سر پر گھاس کا ایک گٹھا لاد رکھا تھا، اور گھوڑی پر خود سوار ہو کر ٹِک ٹِک کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ حماقت بھرا حال دیکھ کر ایک شخص نے اُس سے پوچھا۔

"میاں بڑے بے وقوف ہو! خود تو تم اِس تیز رفتار گھوڑی پر سوار ہو مگر گھاس کا گٹھا اپنے سر پر لاد رکھا ہے۔ ایسا کیوں بھئی! یہ گھاس بھی گھوڑی پر کیوں نہ رکھ لی"۔

یہ بات سُن کر بے وقوف صاحب نے جواب دیا۔

"اے عزیز! بے وقوف میں نہیں ہوں۔ بے وقوف تو ہی ہے۔ ارے یہ گھوڑی گابھن ہے۔ ایک تو اس کی کمر پر میں چڑھا ہوا ہوں، اُوپر سے اس پر گھاس کا گٹھا بھی لاد دیتا تو اتنا بوجھ یہ بھلا کہاں اُٹھا سکتی تھی"۔

بے وقوف کی اِس بات کو سُن کر اُس آدمی نے کہا۔

"ہاں! واقعئی تو عقل مند ہے اور میں بے وقوف!"

گدھا گُم ہونے کی خوشی

ایک آدمی کا گدھا کہیں گُم ہو گیا تو اُسے گدھے کی جُدائی کا بڑا افسوس ہوا۔ گدھے کے یوں غائب ہو جانے پر وہ افسوس بھی کرتا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ شُکر بھی ادا کرتا جاتا۔ ایک شخص نے جو یہ تماشہ دیکھا تو اُس نے پوچھا۔

"کیوں بھئی! یہ کیا بات ہے کہ تم اپنے گدھے کے گُم ہو جانے پر افسوس کے ساتھ شکر بھی ادا کر رہے ہو؟ اِس عجیب حرکت کا کیا سبب ہے؟"

گدھے کے مالک نے یہ سوال سُن کر جواب دیا۔

"اے عزیز! میں اِس واسطے شکر کر رہا ہوں کہ یہ اچّھا ہی ہوا کہ اُس گدھے پر اُس وقت میں سوار نہ تھا، نہیں تو اُس کے ساتھ ہاتھ کے ہاتھ میں بھی گُم ہو جاتا۔"

شیطان کی داڑھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی نے خواب میں شیطان کو دیکھا تو بڑا غُصّہ آیا۔ اُس نے جھٹ سے شیطان کی لمبی داڑھی پکڑ کر تڑاق سے ایک طمانچہ جڑ دیا اور کہا۔

"کیوں بے شیطان بے ایمان! تو نے یہ داڑھی اِسی واسطے بڑھائی ہے کہ اس طرح تو سیدھے سچّے انسانوں کو دھوکہ دے کر اُنھیں گُمراہ کرے"۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک اور زوردار طمانچہ شیطان کے گال پر جڑا۔ فوراً ہی بھائی کی آنکھ کُھل گئی۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ اپنی ہی داڑھی اپنے ہاتھ میں ہے اور دونوں گال طمانچوں کی مار سے جھلا رہے ہیں۔

چوتھا باب

ظریفوں کی کہانیاں

ایک ٹانگ کا مُرغ

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی رئیس نے اپنے نوکر سے مُرغ کا سالن پکوایا۔ جس وقت کہ وہ خوش ذائقہ سالن پک کر تیار ہوگیا تو اُس کی بُو باس سے نوکر بے قابو ہوگیا، اور یہ حرکت کی کہ اُس بُھنے ہوئے مُرغ کی ایک ران ہنڈیا میں سے نکال کر چٹ کر لی، اور ایک ران معہ سینہ و بازو اپنے آقا کے دسترخوان پر سجا کر پیش کر دی۔ آقا نے جو دسترخوان پر مُرغ کی ایک ہی ران دیکھی تو نوکر سے کہا شعر

"مری عقل اِس جا پہ حیران ہے
کہ اِس مُرغ کی ایک کیوں ران ہے"

نوکر بھی تھا بڑا چلتا پُرزہ۔ مسخرے پن سے بولا۔

"خُداوندِ نعمت! اِس نالائق مُرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی شعر

میرا اِس میں ہرگز نہیں ہے قصور
جو تھا گوشت سو آپ کے ہے حضور

آقا نے جو یہ بے سر پیر کی بات سُنی تو بولا۔

"اے گدھے! کہیں مُرغ کی ایک ٹانگ بھی ہوتی ہے جو تو یہ واہیات بات میرے دو بدو کرتا ہے؟" غرض کہ آقا نے اُسے قائل کرنے کے لیے

بہتیرا سر مارا پر وہ یہی کہتا رہا۔

"خداوندِ نعمت! آپ جتنی چاہیں گالیاں دے لیں، غلام کو ٹھونک لیں، پر اس مُرغ کی تھی ایک ہی ٹانگ۔"

آقا بے چارہ کہاں تک اِس مسخرے سے تکرار کرتا، ہار جھک مار کر چُپ ہو رہا۔

چند روز کے بعد اتفاق یوں ہوا کہ آقا کوچہ و بازار کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ ایک گلی میں کسی کا مُرغ بازو میں سر ڈالے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اُس مسخرے نوکر نے جو دیکھا تو جھٹ مُرغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آقا سے کہا۔

"خداوندِ نعمت! اُس دن آپ فرماتے تھے کہ ایک ٹانگ کا مُرغ نہیں ہوتا! دیکھ لیجیے یہ سامنے ایک ٹانگ کا مُرغ کھڑا ہے۔"

اِس زبان دراز اور مسخرے نوکر کی یہ واہیات بات سُن کر آقا نے تالی بجا کر جو مُرغ کو "ہُش" کیا تو وہ مُرغ دوسری ٹانگ نکال کر کھڑا ہو گیا تب آقا بولا۔

"اے اندھے احمق! لے، دیکھ لے اِس مُرغ کی دونوں ٹانگیں ہیں یا نہیں؟"

نوکر بھی کوئی ایسا ویسا تو تھا نہیں! بڑا چھٹا ہوا تھا۔ بھلا وہ کہاں ہار ماننے اور قائل ہونے والا تھا۔ پھٹ سے بولا۔

"خداوندِ نعمت! یہ تو خوب ترکیب ہے! لیکن حضور! آپ نے اُس دن سالن کی رکابی پر کیوں نہ تالی بجا دی جو بُھنے ہوئے مُرغ کی دونوں ٹانگیں حاضر ہو جاتیں۔"

نوکر کا یہ لطیفہ سُن کر آقا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سچ ہے بھائی! آج تو جھوٹے نے سچّے کو قائل کر دیا۔

پہلے دن کی دیوانگی

ایک ظالم بادشاہ تھا۔ ایک دن ہرن کا شکار کرنے کے لیے اکیلا جنگل میں نکل گیا۔ وہاں اسے ایک آدمی ملا۔ وہ آدمی خوبصورت تھا اور دیکھنے میں شریف نظر آتا تھا۔ کڑی دُھوپ کی وجہ سے وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ بادشاہ بھی اُسی درخت کے سائے میں آکر کھڑا ہو گیا اور اُس آدمی سے پوچھا۔

"اے عزیز! سچ بتا، اِس مُلک کا بادشاہ اپنی رعایا کا خیر خواہ ہے یا ظالم اور ستم گر؟"

وہ آدمی بولا۔

"اے شہ سوار! کچھ نہ پوچھ، اِس مُلک کا بادشاہ بہت ظالم ہے۔"

یہ دِل شکن کلام سُن کر وہ غفلت کا شکار بادشاہ کہنے لگا۔

"اے عزیز! تو مجھ کو بھی پہچانتا ہے کہ میں کون شخص ہوں؟"

اُس آدمی نے جواب دیا۔

"میں غم کا مارا کیا جانوں کہ تو کون بلا ہے اور کس کھیت کی مولی ہے۔ بیکار گفتگو سے کیوں میرا سر پھراتا ہے۔"

یہ سُن کر کہا شہ نے "اے نابکار!
اِسی شہر کا میں تو ہوں شہر یار
مِرا ہفت کشور ہے زیرِ نگیں
مجھے باج دیتا ہے خاقانِ چیں
تجھے اپنے جی کا نہ تھا خوف کیا
جو تو نے مجھے اِس طرح بد کہا"

اُس آدمی نے جو یہ حوصلہ شکن بات سُنی تو دِل میں بہت ڈرا لیکن دلیری سے بولا۔

"اے بادشاہِ عالی جاہ! تو بھی مجھ کو پہچانتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔

"اے عزیز! میں تجھ کو نہیں جانتا ہوں کہ تو کون ہے"۔

اُس آدمی نے کہا۔

"اے بادشاہِ عالی جاہ! میں ایک سوداگر کا بیٹا ہوں، لیکن ستاروں کی نحوست سے ہر مہینے میں تین دِن پوری طرح، سِڑی اور وحشی ہو جاتا ہوں، چنانچہ میری دیوانگی کا آج یہ پہلا روز ہے"۔

بادشاہ اُس کی چالاکی پر بے اختیار ہنس پڑا، اُسے تسلّی دی اور کچھ اشرفیاں دے کر اپنے شہر میں آیا —— اور ظلم و ستم ترک کر کے عدل و انصاف سے کام لینے لگا۔

اندھا دولت

کہنے والوں نے کہا ہے کہ تیمور لنگ بادشاہ جب ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے نہایت خوش ہو کر کہا۔

"بزرگوں سے میں نے سُنا ہے کہ ہندوستان میں ایک سے ایک بڑھ کر خوش آواز گانے والے ہیں"

بادشاہ تیمور لنگ کی یہ بات سُن کر ایک گانے والا حاضر ہوا۔ وہ اندھا تھا، مگر تھا بڑا خوش لہجہ۔ اپنے فن کا کامل اور اُستاد تھا۔ گانا گانے میں وہ ایسا یگانہ تھا کہ لگتا تھا کہ اُس کی ہر تان میں تان سین اور اودھو نایک کی رُوح سما گئی ہو۔ تال سُریں وہ اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ ہر دیس کے راگوں سے وہ خوب واقف تھا۔ اُس کی آواز میں غضب کا جادو بھرا ہوا تھا۔ اُس اندھے گایک نے تیمور لنگ کے حضور ایسا عُمدہ گانا گایا کہ ساری محفل بے خود ہو گئی۔ بقولِ میر حسن۔

غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے
اڑے جس جگہ سو اڑے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے
جو بیٹھے سو بیٹھے نہ وہ ہل سکے

غرض یہ کہ اُس کے گانے سے ساری محفل نے بڑا لطف اُٹھایا تیمور لنگ
بادشاہ نے اُس سے پوچھا۔
"گایک تیرا کیا نام ہے؟"
گایک نے نہایت ادب سے جواب دیا۔
"حضور! اِس غلام ناکام کا نام 'دولت' ہے۔"
تیمور لنگ بادشاہ نے مُسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھّا! دولت بھی اندھی ہوتی ہے؟" جو تو نے اپنا نام دولت
رکھا ہے؟
اندھا گایک تھا بڑا مُنہ پھٹ، فوراً جواب دیا۔
"قربان جاؤں حضور! اگر دولت اندھی نہ ہوتی، تو لُولے لنگڑوں
کے کیوں ہاتھ آتی۔"
یہ لطیفہ سُن کر تیمور لنگ بادشاہ بہت خوش ہوا، اور اندھے 'دولت'
کو دولت سے مالامال کر دیا۔

دو کوّے

ایک شخص نے رات میں اپنے نوکر سے کہا۔
"دیکھ بھئی! اگر صُبح کے وقت کبھی تجھے دو کوّے برابر برابر بیٹھے ہوئے نظر آئیں تو فوراً مجھے خبر کرنا کیونکہ صُبح کے وقت دو کوّوں کا دیکھنا نیک شگون ہے۔" یہ کہہ کر مالک سو گیا۔ نوکر نے اتّفاق سے صُبح کو دیوار پر دو کوّے بیٹھے ہوئے دیکھے۔ فوراً بھاگا ہوا اپنے مالک کو خبر کرنے گیا۔ مگر اِس سے پہلے کہ مالک آتا ایک کوّا اُڑ گیا، اور ایک اکیلا بیٹھا رہا۔ جب مالک آیا اور اُس نے دیکھا تو ایک ہی کوّا نظر آیا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خفا ہوا اور نوکر سے بولا۔
"اے کوّے! میں نے دو کوّے دیکھنے کو کہا تھا یا ایک منحوس کوّے کو کہا تھا۔" نوکر بے چارہ خاموش کھڑا سُنتا رہا۔ مالک برا برا سے بُرا بھلا کہتا رہا۔
"تو بڑا شریر ہے! اپنی فطرت سے باز نہیں آتا! اُلّو کہیں کا۔ مار مار کے تیرے بدن کو لال کر دوں گا۔ چل میرے سامنے سے اُڑ جا میں اور نوکر رکھ لوں گا۔ تجھ میں کیا سُرخاب کا پر لگا ہے، یا تو عنقا نوکر ہے۔ میری اگر قسمت بھلی ہے تو تجھ جیسے ڈھیر سارے لٹورے، اُلّو، کالے بھجنگے میری

خدمت کو آرہیں گے۔ کیا دُنیا میں اور نوکر نہیں ملتے۔ بخدا! اب میں تجھ کو نوکر نہ رکھوں گا۔"

غرض کہ مالک ابھی بک بک کر رہی رہا تھا کہ اچانک اُس کے کسی دوست کے ہاں سے عُمدہ عُمدہ کھانوں کا ایک خوان اُس کے لیے آگیا۔ نوکر نے جو یہ دیکھا، تو وہ بولا۔

"حضور! اب آپ کبھی دو کوّے دیکھنے کا ارادہ نہ کیجیے گا، نہیں تو آپ کی میری جیسی حالت ہو گی۔ آپ نے ایک کوّا دیکھا تو کھانے کا خوان آیا۔ میں نے دو کوّے ایک ساتھ دیکھے تو اُس کے بدلے گالیاں اور جھڑکیاں کھائیں۔

"اِس میں کیا شک ہے"

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی شوقین آدمی نے ایک طوطا پالا۔ اُسے بڑی ریاضت اور محنت سے بولنا سکھایا۔ مگر طوطا صرف اِتنا ہی بولنا سیکھ پایا کہ ہر بات کے جواب میں کہتا۔ "اِس میں کیا شک ہے"!

پھر یوں ہوا کہ وہ آدمی ایک بار اِس طوطے کو بازار میں لے کر گیا اور اُس کی قیمت سو روپے مقرّر کی۔ اتفاقاً ایک مُغل زادہ اُدھر آنکلا۔ اُس نے جو اس طوطے کی قیمت سُنی تو بولا۔

"اے طوطے سچ سچ بتا! کیا تو واقعیؔ سو روپے کے لائق ہے"

طوطے نے جھٹ جواب دیا۔

"اِس میں کیا شک ہے"

مُغل زادے نے جو طوطے کا یہ جواب سُنا تو بہت خوش ہوا۔ اور آگا پیچھا سوچے بغیر سو روپے اُس آدمی کو دے کر طوطے کو اپنے گھر لے آیا۔ جب بھی وہ کوئی بات طوطے سے پُوچھتا تو وہ یہی ایک جواب دیتا۔

"اِس میں کیا شک ہے"

تھوڑے ہی دِنوں بعد مُغل زادے کو احساس ہوا کہ وہ اُتو بن

گیا۔ آخر ایک دِن اُس نے غُصّے ہو کر کہا۔
"اے بدبخت طوطے! میں نے نہایت حماقت کی جو تجھ مٹھی بھر پر کو سو روپے میں خریدا۔"
"اِس میں کیا شک ہے؟" طوطے فوراً جواب دیا۔
یہ جواب سُن کر مُغل زادہ مُسکرایا اور طوطے کو آزاد کر دیا۔

دوہرا انعام

ایک امیر اپنے مکان میں تیر سے میخ پر نشانہ لگا رہا تھا۔ مگر اس کا نشانہ صحیح نہیں بیٹھتا تھا۔ وہاں اور بھی کچھ تیر انداز موجود تھے، وہ بھی بڑی دیر سے تیر زنی کر رہے تھے، پر ان میں سے کسی کا بھی نشانہ دُرست نہ لگ رہا تھا۔ اسی درمیان کہیں سے ایک فقیر مانگتا تانگتا وہاں آ موجود ہوا، اور امیر کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ امیر نے بجائے بھیک دینے کے اُس کے ہاتھ میں تیر کمان تھما دیا اور کہا۔

"اے فقیرِ روشن ضمیر! اگر تو اس میخ پر تیر سے دُرست نشانہ لگائے گا تو تیرا سوال بر آئے گا۔"

اب دیکھیے خدا کی قدرت! فقیر نے جو تیر چلایا تو سیدھا میخ پر جا کر لگا۔ پھر کیا تھا سبھوں نے خوب تعریف کی اور امیر نے بہت خوش ہو کر سو روپے فقیر کو دیے۔ فقیر نے وہ سو روپے تو اپنی جھولی میں ڈال لیے پر وہاں سے ٹلا نہیں، بلکہ اُلٹا کہنے لگا۔

"بابا! اس فقیر کا سوال پورا نہ ہوا۔"

امیر نے جو فقیر کی یہ ڈھٹائی سے بھری بات سُنی تو غُصّے میں بولا۔

"اے لالچی! تجھ کو جو میں نے ابھی سو روپے دیے ہیں! وہ تیری

نگاہ میں نہ آئے۔ اِس کے کیا معنی!"

فقیر تھا بڑا خوش گفتار۔ فوراً بولا۔

"اے امیر! اگر تجھے ناگوار نہ گزرے تو میری یہ عرض ہے کہ، وہ سو روپے تو میں نے منع پر تیر مارنے کے لیے ہیں۔ سوال کا اُس میں کیا ذکر ہے۔ میرا سوال تو اپنی جگہ باقی ہے۔ تو خواہ مخواہ فقیروں سے بگڑتا ہے۔"

فقیر کی یہ بات سُن کر امیر بہت خوش ہوا اور سو روپے اور اُسے انعام میں دیے۔

تم بھی خوش، ہم بھی خوش

ایک شاعر تھا۔ وہ اِتنا عُمدہ اور بڑا شاعر تھا کہ اُس کی شاعری کو اگر فارسی کے مشہور شاعر جیسے صائب اور حافظ، کبھی سُن پاتے تو رشک کرنے لگتے۔ ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وہ چند بہت عُمدہ اور مزے دار اشعار ایک دولت مند شخص کی تعریف میں کہہ کر اُس کے پاس لے کر گیا تاکہ وہ دولت مند شخص ان اشعار میں اپنی تعریف سُن کر خوش ہوا اور خوش ہو کر شاعر کو ڈھیر سارے روپے انعام دے کر مالا مال کر دے۔ دولت مند نے جب یہ اشعار سُنے تو وہ خوش ہو کر بولا۔

"واقعیٔ تو ایسا شاعر ہے کہ تیرا کلام سُن کر بڑے بڑے شاعر بھی رشک کی آگ میں جل مریں۔ اِس میں شک نہیں کہ تو نے یہ بڑا دِلکش اور بہت پُر لُطف قصیدہ لکھا ہے۔ اور اِس محنت سے لکھا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کی کیا مجال اور کیا جرأت ہے جو وہ ایسا قصیدہ لکھ کر تجھ سے بڑھ جائے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اِس کے صلے میں تیری جھولی روپوں پیسوں سے بھر دوں، پر کیا کروں رونے کا مقام ہے کہ جی کی حسرت جی ہی میں رہی جاتی ہے۔ ہائے! اگر آج یہ بدنصیب اور جگر سوز دولت مند اور شان و شوکت والا ہوتا تو برحق امام حسن و حسینؓ تجھ

پریشاں حال اور دِل شکستہ کو زمانے کی رسم و رواج کے مُطابق دُنیا بھر کی دولت سے مالامال کر دیتا، کیونکہ آج کون سا شاعر ہے۔ جو تیری برابری کر سکے۔ تیرے آگے ہر ایک کا قافیہ تنگ ہے۔ کوئی تیرا ہم پلّہ نہیں ہو سکتا۔

غرض کہ وہ عقل مند، دولت مند، بہت دیر تک شاعر کی تعریف کرتا رہا اور اُسے بانس پر چڑھاتا رہا، پھر نہایت خوشامد اور انکسار کے ساتھ بولا۔

"اے اُستادِ زمانہ! اس وقت میرے پاس نقد روپے نہیں ہیں، جو اِس لاجواب قصیدے کے انعام میں دوں! مگر میرے مکان میں اناج بہت ہے۔ تو ایسا کر کہ صُبح کے وقت بار برداری کا انتظام کرکے بلاتکلف میرے پاس آجانا، اپنی حیثیت کے مُطابق میں تیری خدمت بجا لاؤں گا۔"

بے چارہ شاعر دولت مند کی یہ دِل خوش کُن بات سُن کر، اناج کے لالچ میں، نہایت خوش خوش گھر آکر سو گیا۔ جب صُبح ہوئی تو بار برداری کا بند و بست کرکے اُس دولت مند کے مکان پر گیا اور اناج کا طالب ہوا۔

وہ دولت مند شاعر کا یہ مُطالبہ سُن کر خوب ہنسا اور بولا۔

"اے بے عقل! تو نے مزے دار اور دِلچسپ شعروں سے جس طرح مجھ کو خوش کیا اُسی طرح میں نے بھی اپنی چٹپٹے دار باتوں سے تجھ کو خوش کر دیا۔ تیرا میرا احساب برابر۔ بہ قول شخصے

نہ اودھو کا لین، نہ مادھو کا دین
جاؤ تم اپنے گھر خوش اور ہم اپنے گھر خوش

اندھے کا چراغ

ایک اندھا تھا۔ اُس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے اپنے کندھے پر پانی کا ایک گھڑا رکھا اور ہاتھ میں ایک چراغ لیا اور گھور اندھیری رات میں نکل کھڑا ہوا۔ یہ عجیب و غریب ماجرا دیکھ کر ایک شخص نے اُس سے کہا۔

”اے کمزور و ناتواں اندھے! اس وقت تجھے یہ کیا سُوجھی کہ اتنی اندھیری رات میں تو ہاتھ میں چراغ لے کر نکلا ہے۔ تو، تو بڑا بے وقوف ہے۔ تیرے لیے تو رات اور دن، خزاں اور بہار دونوں برابر ہیں۔ بھلا چراغ کی اس روشنی سے تیرا کیا فائدہ ہوگا۔“

اندھے نے جو یہ باتیں سُنیں تو تڑخ کر بولا۔

”اب بے وقوف تو تو ہے! میں تو ظاہر کا اندھا ہوں، اور یہ چراغ میرے لیے نہیں ہے۔ یہ چراغ تو تجھ باطن کے اندھے کے واسطے ہے کہ کہیں اس اندھیری رات میں تو میرا پانی سے بھرا گھڑا نہ توڑ دے۔ یعنی چراغ کی روشنی سے تجھ پر روشن ہو کہ اندھا پانی کا گھڑا لیے آتا ہے، تو آپ ہی بچ کر چلے گا۔ شعر

نہیں تو اندھیرے میں کیوں کر بھلا

اے اندھے یہ اندھا تجھے سُوجھتا۔“

یہ انوکھی دلیل سُن کر وہ بے چارہ چراغ خاموش کی مانند خاموش ہو گیا اور کچھ جواب نہ دیا۔

اندھا دوست

کہتے ہیں کہ ایک نہایت مفلوک الحال اور غربت کا مارا شخص قسمت کی خوبی سے اتفاقاً بے حد مال دار اور صاحبِ عزت ہوگیا۔ لیکن ہوا یہ کہ دولت مندی اور عزت اُسے پچی نہیں، چنانچہ اس کا چال چلن بگڑ گیا۔ وہ رات دن عیش و طرب میں پڑا رہتا تھا۔ جب وہ مفلوک الحال تھا، تب اُس کا، اس ہی جیسا ایک نہایت گہرا وفادار دوست بھی تھا۔ اُس دوست کو جو یہ خبر ملی کہ اُس کا دوست اب امیر ہوگیا ہے اور بہت شان سے رہتا ہے، تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے مال دار دوست کو مُبارک باد دینے کے لیے اُس کے گھر آیا۔ مال دار دوست کو اپنے اُس غریب دوست کو گھر پر دیکھ کر بڑا غصہ آیا، سو وہ نہایت بھڑک کر بولا۔

"اے عزیزِ بے تمیز! تو کون ہے؟ جو میرے پاس یوں بے کھٹکے چلا آیا ہے

میں نہیں واقف ہوں تیرے نام سے

کام کیا ہے تجھ کو میرے نام سے"

اس غریب بے چارے نے جو غیر متوقع طور پر یہ دِل شکن بات اُس

باطن کے اندھے دوست کی سُنی تو بھونچکا رہ گیا۔ خیر اپنے آپ کو سنبھال کر وہ بولا۔

"اے یارِ وفادار! تو مجھ کو پہچانتا ہے۔ میں تیرا وہی قدیم یار غار اور تیرا غم خوار ہوں۔ لیکن! تو نے مجھے پہچاننے سے انکار کیا۔ میں نے سچّے لوگوں اور اپنے پکّے اور وفادار دوستوں سے سُنا تھا کہ میرا فلاں دوست اندھا ہو گیا ہے، سو میں یہ سُن کر تیری عیادت اور تعزیت کے واسطے آیا تھا۔"

آدھا منہ کالا

ایک درویش تھا۔ اُس سے کوئی جُرم سرزد ہوگیا۔ ایک حبشی کوتوال تھا جو بالکل کالا بھجنگ تھا۔ حبشی کوتوال نے حکم دیا کہ اس مُجرم درویش کا منہ کالا کر کے شہر سے باہر نکال دو۔

درویش نے جو یہ بات سُنی تو فوراً بولا۔

"اے بدخصال، حبشی کوتوال! اس حقیر فقیر کا آدھا منہ سیاہ کر کے شہر بدر کر، نہیں تو سارے شہر کے لوگ سمجھیں گے کہ بادشاہِ عالم پناہ نے حبشی کوتوال کو شہر بدر کر دیا ہے۔" یہ لطیفہ سُن کر کوتوال بہت خوش ہوا اور درویش کا جُرم معاف کر دیا۔

دو گدھوں کا بوجھ

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ سیر و شکار کے لیے نکلا۔ اُس کا بیٹا اور نوکر بھی اُس کے ساتھ تھے۔ دیکھتے دیکھتے دوپہر کا وقت آن پہنچا اور بڑی سخت گرمی ہونے لگی۔ بادشاہ اور شہزادے نے گرمی کی شدّت کی وجہ سے اپنے اپنے لبادے اُتار کر نوکر کے کندھے پر لاد دیے۔ بادشاہ نے مُسکراتے ہوئے نوکر سے کہا۔

"ان دونوں لبادوں کا بوجھ تجھ پر ایک گدھے کے بوجھ کے برابر ہو گیا۔"

نوکر تھا مسخرہ جھٹ جواب دیا۔

"قربان جاؤں حضور! ایک گدھے کا بوجھ کیا حضور! دو گدھوں کا بوجھ ہے۔" یہ جواب سُن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور دونوں لبادے نوکر کو بخش دیے۔

ناخوشی کے دن خوشی

ایک بادشاہ کی وفادار فوج میدانِ جنگ میں دُشمن کی فوج سے بُری طرح ہار گئی۔ یہ منحوس اور وحشت اثر خبر جو ایک شخص نے سُنی تو دوڑا دوڑا آیا اور بادشاہ سے کہا۔

"خداوندِ نعمت! فتح و نصرت مُبارک ہو۔"

بادشاہ نے اپنی فوج کی جیت کی جو یہ خوش خبری سُنی تو بہت خوش ہوا۔ لیکن دو روز بعد شترسوار کی زبانی بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اُس کی شہرۂ آفاق فوج دُشمن کی فوج سے جیتی نہیں بلکہ ہاری ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی غضبناک ہوکر بادشاہ نے وزیر سے کہا۔

"اُس جھُوٹے شخص کو بُلوا کر جوتے مارو اور پوچھو کہ اُس نے بادشاہ کے سامنے جھوٹ کیوں بولا۔"

وہ آدمی بُلوایا گیا۔ اُس نے آکر کہا:۔

"خداوندِ جہاں! یہ غلام آج سزا کا مستحق نہیں ہے بلکہ انعام و اکرام کے لائق ہے اِس لیے کہ وہ دن آپ کے لیے رنج و غم کا دن تھا تو میں نے خوشنودی کی خبر سُنا کر حضور کو خوش کیا تھا۔ آج کا دِن بھی

ناخوشی کا ہے، اِس لیے اب حضرت پر لازم ہے کہ آج مجھ محتاج کو انعام واکرام سے نواز کر خوش کریں تو بجا ہے۔"

بادشاہ نے یہ بات سُن کر اُس کا سارا قصور معاف کر دیا۔

قسم کھالے

ایک غریب آدمی، قاضی کے پاس گیا اور یوں مخاطب ہوا۔

"اے قاضی! میں بڑا غریب ہوں، اور بھوکا! خدا کے واسطے مجھے اتنا کھانا دے کر میرا پیٹ بھرے۔ تجھ کو اس کا بے حساب ثواب ملے گا۔ مثل مشہور ہے۔"جو دے گا، سو پائے گا۔"

یہ باتیں سن کر قاضی نے جواب دیا۔

"اے عزیز صاحب تمیز! کیا تو نے یہ مثل نہیں سنی کہ "قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے"۔ سو جو قاضی کے گھر آتا ہے، اُسے کھانے کے لیے قسم ملتی ہے۔ اب اگر تیرا جی چاہے تو جھوٹ سچ جس میں تیرا پیٹ بھرے، ویسی قسم کھالے۔"

"بان" والے

ایک بادشاہ نے ایک امیر سے کہا۔
"اے امیر دل پذیر! جن لوگوں کے نام کے ساتھ لفظ "بان" ہوتا ہے وہ مکّار اور فطرتی ہوتے ہیں۔ جیسے، فیل بان، باغ بان، ساربان، گاڑی بان، دربان، شعر

مرے اس سخن کو نہ تو جھوٹ جان
کہ ہے اِن سبھوں کی عجب آن بان

امیر نے جواب دیا۔

"بجا آپ کہتے ہیں اے 'مہربان'
کہ یہ 'بان' والے ہیں سب بدزبان
انہیں 'بان' داروں کو اس آن میں
مقیّد کا ہو حکم شعبان میں

غرض سن کے یہ گفتگوئے امیر
ہوا بادشاہ دل میں اپنے حقیر

پانچواں باب

افیونیوں کی کہانیاں

اپنے گھر کا مہمان

ایک دولت مند افیونی بڑا یار باش تھا۔ افیون کی لت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اُس کی دولت ختم ہو گئی اور وہ قلاش ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھانے پینے تک کے لالے پڑ گئے اور وہ لاغر و کمزور ہو کر گھر گھسنا ہو کر رہ گیا۔ دن بھر میں پڑا اونگھتا رہتا، اور کچھ کام کاج نہ کرتا۔ ایک دن اُس کی بیوی نے جل بھن کر اُسے مشورہ دیا۔

"اے عزیز صاحب تمیز! مردوں کو اس قدر گھر گھسنا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی نحوست کا سبب ہے۔ اس پُر ملامت حالت سے اگر تجھے چھٹکارا پانا ہے تو اُٹھ اور سفر پر نکل۔ اور اتنا کچھ کما کر لا کہ روزی روٹی کا کام چلے۔"

اپنی نیک سیرت بیوی کا یہ عمدہ مشورہ سُن کر افیونی نے جواب دیا۔
"بہت خوب! میں کل سفر پر نکلوں گا۔"

غرض کہ وہ اگلے دن سویرے تڑکے ہی سفر کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ افیونی شہر کے باہر پہنچا تو وہاں اُسے ایک نہایت عمدہ اور جاں فزا تکیہ نظر آیا۔ اُس وقت میاں افیونی کے دل میں یہ ترنگ آئی کہ اس جگہ بیٹھ کر تھوڑا سا نشہ پانی کرنا چاہیے۔ کچھ دیر یہاں

آرام کیجیے۔ اُس کے بعد اطمینان سے اپنی منزلِ مقصود کی راہ پکڑیے۔
یہ سوچ کر میاں افیونی وہاں بیٹھ گئے اور نشے پانی میں مشغول ہو گئے۔ افیون کھا پی کر وہیں سو گئے۔ خوب پیٹ بھر کے سوئے، اور سوتے سوتے جو یکایک آنکھ کھُلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دن بہت تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ یکایک گھبرا کے اُٹھے اور بولے۔

تھک گئے میرے پاؤں تو افسوس
ابھی منزل پڑی ہے کالے کوس

حاصل کلام یہ کہ میاں افیونی جلدی سے اُٹھے، ہاتھ میں حُقّہ لیا اور نشے کی حالت میں اُونگھتے ٹہلتے چل کھڑے ہوئے۔ بھائی نے آگے جانے کے بجائے، جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی کا رُخ لیا اور آہستہ آہستہ واپس آ گئے اپنے ہی شہر میں۔ لیکن سمجھے یہ کہ وہ کسی دوسرے شہر میں آئے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص سے اِس شہر کا نام پوچھا۔ ظاہر ہے اُس نے وہی نام بتایا جہاں میاں افیونی رہتے تھے۔ افیونی نے جو شہر کا نام سُنا تو حیرت میں پڑ گیا اور دِل ہی دِل میں کہنے لگا۔
"سُبحان اللہ! خدا کی قدرت بھی عجیب ہے۔ یہ شہر تو ہمارے ہی شہر کا ہم نام ہے۔"
خُدا کی قدرت کی دِل ہی دِل میں داد دیتے ہوئے، اور آگے بڑھا اور شہر کے درمیان ایک اور مقام پر پہنچ کر ایک دُکاندار سے پوچھا۔
"اے بھائی! اِس شہر میں کوئی افیونی بھی رہتا ہے؟ تاکہ اُس کے گھر میں صُبح و شام اپنے نشے پانی کا بندوبست ہو سکے۔"
دُکان دار نے جواب دیا۔

"اے عزیز باتمیز! فلاں محلّے میں فلاں افیونی رہتا ہے۔ تو اُس کے گھر جائے گا تو تجھے ہر طرح کا آرام مِلے گا۔

ہے نزدیک یاں سے نہ کچھ دُور ہے
وہ اِس شہر میں خوب مشہور ہے

محلّے اور افیونی کا نام سُن کر اب تو میاں افیونی دریائے حیرت میں ڈوب گئے۔ اور دِل ہی دِل میں کہنے لگے۔

"یہ بھی عجیب و غریب بات ہے۔ یہ افیونی بھی ہمارا ہم نام ہے، اور تو اور محلّے کا بھی وہی نام ہے جو ہمارے محلّے کا نام ہے۔ واہ! ایسا حُسنِ اِتّفاق اِس دُنیا میں کم دیکھنے میں آیا ہے!"

لوگوں سے اپنے محلّے کا اتہ پتہ پُوچھتا پاچھتا آخر اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچا اور دستک دے کر ہانک لگائی۔

"ذرا دروازہ کھول دو بھائی! ایک مُسافر غریب بے نصیب تمھارے گھر میں مہمان آیا ہے۔"

اپنے گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو چُکی تھی۔ دروازے پر دستک اور آواز سُن کر گھر کی ملازمہ نے دروازہ کھولا اور بولی۔

"میاں صاحب! ہمارے گھر کا مالک آج سفر کو گیا ہے مگر آپ بلا تکلّف اندر تشریف لائیے، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

مُلازمہ کی بات سُن کر افیونی نے دِل میں خیال کیا۔

"واہ بھئی واہ! یہ بھی عجیب اتّفاق ہے کہ ہماری اور اس افیونی کی ہر جگہ اور ہر معاملے میں برابری چلی آ رہی ہے، یعنی ہم بھی آج ہی سفر کو نکلے، اور وہ بھی آج ہی سفر پر روانہ ہوا۔ اور تو اور اس کے گھر کی

بناوٹ بھی ہمارے ہی گھر کی طرح ہے۔"
یہ سوچتے ہوئے میاں افیونی ذن سے گھر کے اندر داخل ہوئے اور دیوان خانے میں جاکر براجمان ہو گئے۔ مہمان کی خاطر ملازمہ چراغ روشن کرکے دیوان خانے میں لائی تو کیا دیکھتی ہے کہ مسافر تو نہیں بلکہ خود میاں صاحب ہی اپنے مکان میں جلوہ گر ہیں۔ یہ حیرت انگیز ماجرا دیکھ کر دوڑی دوڑی اندر گئی اور بی بی سے کہا۔
"اے بی بی! وہ جو آئے ہیں، وہ کوئی مہمان نہیں۔ خود میاں صاحب تشریف لائے ہیں۔"
بی بی نے جو یہ کلام سُنا تو جھلّا کے بولیں۔
"چل مُردار! کیا جھک مارتی ہے؟ وہ بے چارہ مُصیبت کا مارا خُدا جانے کہاں ہوگا؟ اگر وہ ہوتا تو باہر کیوں بیٹھتا۔ بے دھڑک اندر نہ آجاتا۔"
بی بی کی یہ بات سُن کر ملازمہ چُپ ہو گئی۔ بی بی نے دِل میں سوچا۔
"میرے گھر میں آج ایک انجان مہمان آیا ہے، اور گھر کا مالک ہے نہیں، زیادہ تکلّف نہ کر سکوں تو کم از کم ملائی اور میٹھے چاول تو اس کے لیے بھیج ہی دوں تاکہ وہ بھی سمجھے کہ ہاں کسی افیونی کے گھر میں مہمان ہوا تھا۔"
غرض کہ بی بی نے خوش ذائقہ کھانا پکا کر افیونی کے لیے بھیجا۔ اس خوش گوار کھانے کو دیکھ کر افیونی کو اور حیرت ہوئی، اور دِل ہی دِل میں کہا۔
"واہ واہ! کیا خوب بات ہے! ہم کو آج کھانا بھی ویسا ہی مِلا

جیسا کہ اپنے گھر میں ملتا تھا۔ بہ قول شخصے۔

حق شکر خورے کو دیتا ہے شکر۔

اُدھر مُلازمہ کو چین کہاں۔ اُس نے اب کی بار بہت غور سے دیکھا تو صاف صاف میاں صاحب ہی نظر آئے، اُس نے پھر بی بی سے آکر کہا۔ "اے بی بی! تم چاہو تو مجھ کو مار مار کے پُرزے پُرزے کر ڈالو، لیکن میں تو یہی کہوں گی کہ وہ مُسافر نہیں۔ میاں صاحب ہی ہیں۔"

دوبارہ مُلازمہ کی یہی بات سُن کر اب تو بی بی بھی دُبدھا میں پڑ گئی۔ بولی۔ "ٹھیک ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر بی بی نے دیوان خانے کے دروازے کی دراڑ سے آنکھ لگا کر جو دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ سچ مچ مُسافر اُسی انداز سے بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہے، جس انداز سے کہ اُس کے میاں صاحب بیٹھ کر کھاتے تھے۔ یہ دیکھ کر بی بی دبے پاؤں دیوان خانے میں آئی اور میاں افیونی کے پیچھے کھڑی ہو کر خوب غور سے دیکھا تو سچ مچ اُس کے میاں ہی نظر آئے۔ یہ دیکھ کر بی بی کو بہت غصّہ آیا۔ اور اُسی غصّے کے عالم میں اُس نے میاں افیونی کی پیٹھ پر زور سے دو ہتھڑ مارا اور چیخ کر بولی۔

"اے بے حیا! تو، تو آج سفر کے لیے نکلا تھا۔ تو نے اِس وقت وہ مثل سچ کر دی کہ "صُبح کا بھُولا جو شام کو آئے تو اُسے بھُولا نہیں کہتے۔"

خلافِ توقع یہ ماجرا دیکھ کر میاں افیونی تو ہکّا بکّا رہ گئے اور بہت غور سے اپنی بی بی کو دیکھ کر بولے۔

"بی بی! یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں! اگر تم یوں ہی ہمارے ساتھ ساتھ پھرو گی اور پیچھے لگی رہو گی تو ہم سے تو سفر ہرگز نہ ہو سکے گا۔"

تیسرا نوکر

ایک افیونی کا روز کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے نوکر سے پندرہ پیسے کا دُودھ منگوایا کرتا تھا لیکن اُسے دُودھ میں کچھ مزہ نہ آتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ نوکر ضرور کچھ گھپلا کرتا ہے، پورے پیسوں کا دُودھ نہیں لاتا۔ یہ سوچ کر اُس نے ایک اور نوکر پہلے نوکر کی نگرانی پر رکھا اور اس دوسرے نوکر سے کہا
"بھائی دیکھ! تو روز اِس نوکر کے ساتھ جایا کر اور پندرہ پیسے کا دُودھ اُس کے ساتھ لایا کر۔"
دوسرے نوکر نے مالک کا یہ حُکم سُن کر جواب دیا۔
"بہت خوب! آپ کا حُکم بجا لاؤں گا۔"
جب پہلا نوکر دُودھ لینے کے لیے جانے لگا تو دوسرا نوکر مالک کے حکم کے مُطابق اُس کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں اِس دوسرے نوکر نے پہلے نوکر سے پوچھا۔
"کیوں بھئی! یہ ماجرا کیا ہے؟"
پہلے نوکر نے جواب دیا۔
"ارے یار! بات صرف اِتنی سی ہے کہ میں اِس افیونی سے دُودھ کے لیے روز پندرہ پیسے لیا کرتا تھا لیکن لیتا تھا صرف دس پیسے کا دُودھ۔ اِس

میں تھوڑا سا پانی مِلا کر اُسے پلا دیا کرتا تھا۔
"پانچ پیسے اپنے لیے بچ جاتے تھے۔ اب تو جس طرح کہے گا، وہی کروں گا۔"
دوسرے نوکر نے یہ ماجرا سُن کر کہا۔
"ٹھیک ہے۔ اب ایک کام کریں گے۔ اُس مردُود کے لیے اب ساٹ پیسے کا دُودھ لیا کریں گے۔ اِس طرح ہمیں آٹھ پیسے بچیں گے۔ چار پیسے تیرے اور چار پیسے میرے۔ پہلے کے مُقابلے میں تیرا صرف ایک ہی پیسے کا نقصان ہوگا۔"
پہلے نوکر نے خوشی سے جُھوم کر جواب دیا۔
"واہ! کیا بات ہے۔ مجھے بھی یہ بات پسند ہے۔"
غرض کہ وہ دونوں یہی کرتے۔ ساٹ پیسے کا دُودھ خریدتے اور آٹھ پیسے خود آپس میں بانٹ لیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افیونی کو جو اب دُودھ مِلتا تو اس میں اور زیادہ پانی مِلا ہوتا اور اُسے پہلے کے مُقابلے میں اب وہ زیادہ بدمزہ لگتا۔ اُس نے پھر سوچا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ دوسرا نوکر بھی بے ایمان نکلا۔ اِس لیے اب اُس نے ایک اور نوکر رکھا اور اُس سے کہا۔
"میاں! مجھ کو بازار کے دُودھ میں کچھ گھپلا معلوم ہوتا۔ یہ دونوں نوکر بڑے فتنہ گر ہیں۔ ایسا غبن کرتے ہیں کہ میرا پیسے کا پیسہ برباد جاتا ہے اور دُودھ میں خاک مزہ نہیں آتا۔ سو اب تو ان دونوں کے ساتھ جاکر میرے لیے دُودھ خرید کر لایا کر۔"
اس تیسرے نوکر نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔
"حضور! آپ جس کام کو کہیں گے، اُس میں کبھی کھوٹ نہ ہوگا۔ غفورا وہ نوکر نہیں ہوتا جو مالک کے کام کو خراب کرتا ہے۔"

تیسرے نوکر کی یہ بات سُن کر افیونی بہت خوش ہوا۔

غرض کہ جب پہلے دونوں نوکر حسبِ معمول دُودھ لانے کے لیے روانہ ہونے لگے تو افیونی نے تیسرے نوکر سے کہا۔

"لو میاں! ان دونوں بے ایمانوں کے ساتھ جاؤ اور ہمارے لیے خالص دُودھ لے کر آؤ! لیکن خبردار! یہ دونوں ناہنجار کچھ غبن نہ کرنے پائیں۔ اگر اب بھی ویسا ہی بُرا دُودھ آیا تو میں تم سے بھی خفا ہو جاؤں گا۔"

افیونی مالک کے حُکم سے تیسرا نوکر بھی پہلے دونوں نوکروں کے ہمراہ پندرہ پیسے کا دُودھ خریدنے کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے دونوں سے پُوچھا۔

"اے بھائیوں! یہ کیا ماجرا ہے۔ سچ سچ کہو! میں بھی ہر حال میں تمھارا شریک ہوں۔"

"میاں!" پہلے نوکر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "سچّی بات یہ ہے کہ مالک پندرہ پیسے کا دُودھ منگواتا تھا۔ مگر میں صرف دس پیسے کا دُودھ خرید کے اُس میں کچھ پانی مِلا دیا کرتا تھا اور باقی پانچ پیسے خود رکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن جس وقت سے یہ دوسرے صاحب میری نگرانی پر رکھے گئے تو یہ طے ہوا کہ اُس کے لیے سات پیسے کا دُودھ کافی ہے۔ آٹھ پیسے یہ اور میں بانٹ لیتے ہیں۔ پہلے مُجھے پانچ پیسے مِلتے تھے۔ اب چار ہی مِلتے ہیں۔ ایک پیسے کا میرا نقصان ہو گیا ہے۔ خیر! اب جو تو آیا ہے تو جو کچھ تو کہے گا ہم دونوں اُس پر راضی ہیں۔"

یہ ماجرا سُن کر تیسرے نوکر نے کہا۔

"اچھا اب یوں کرو۔ چھ پیسے مجھے دو! چھ پیسے تم دونوں آپس میں

بانٹ لو! تم دونوں کو تین تین پیسے ملیں گے۔ تمھارا بس ایک ایک پیسے کا
ہی نقصان ہوگا۔ باقی رہے تین پیسے تو وہ افیونی کے دودھ کے لیے
بہت کافی ہیں۔ دُودھ لانے کا کام اب مجھ پر چھوڑ دو، میں اِس افیونی
جنونی سے نپٹ لوں گا۔"

پہلے دونوں نوکروں نے تیسرے نوکر کی یہ شرط منظور کر لی۔ پندرہ
پیسے میں سے تین پیسے پہلے نوکر نے لیے۔ تین پیسے دوسرے نے
اور چھ پیسے تیسرے نے۔ اِس بٹوارے کے بعد تیسرے نوکر نے یہ
حرکت کی کہ بچّے ہوئے تین پیسوں کی چچا بھر ملائی خریدی اور افیونی کے
گھر لا کر طاق میں رکھ دی۔

جس وقت افیونی نے افیون سے نشہ پانی کیا اور اُسے خوب
نشہ چڑھ گیا تو اِس فتنہ گر تیسرے نوکر نے یہ حرکت کی کہ میاں افیونی
کی دونوں مونچھوں پر تھوڑی تھوڑی ملائی لگا دی، اور خود وہاں سے
کھسک گیا۔ جب کچھ دیر کے بعد افیونی کا نشہ اُترا اور اُس کی آنکھ کھلی تو
اس تیسرے نوکر کو بُلوا کے پوچھا۔

"کیوں میاں! دُودھ لائے یا نہیں؟"

تیسرے نوکر نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

"حضور! میں دُودھ لایا تھا، اور آپ نے تو پی بھی لیا۔ اُس
دُودھ کو پیے آپ کو بڑی ہوئی۔ میاں دُودھ پینے کے بعد آپ نے
اب تک کلّی بھی نہیں کی۔ ذرا آپ اپنی مونچھوں پر ہاتھ لگا کر تو دیکھیے۔"

یہ سُن کر میاں افیونی نے مونچھوں کو جو ہاتھ لگایا تو ہاتھ ملائی میں بھر گیا۔
یہ دیکھ کر جھٹ تیسرا نوکر بولا۔

"دیکھا میاں! کیا ملائی دار خوش ذائقہ دُودھ تھا کہ جس کی جھلّی آپ کی مونچھوں پر جم گئی۔"
تیسرے نوکر کی اِس بات سے خوش ہو کر میاں افیونی بولے۔
"واہ میرے یار! یہ دُودھ تو بہت عُمدہ اور ذائقہ دار تھا۔ شاباش! اب اگر تو ہمیشہ مجھے اِسی طرح کا دُودھ لا کر دیا کرے گا تو میں بھی تجھے خوش کر دوں گا۔"

گنّے کا کھیت

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ دو افیونیوں نے آپس میں بیٹھ کر یہ مشورہ کیا کہ ہم لوگوں کو مل کر کوئی ایسا کام کرنا چاہیے کہ جس سے ہم لوگوں کے کھانے پینے کا اچھی طرح بندوبست ہو اور بسر اوقات اچھی طرح ہو۔ اور کبھی افیون کی بھی کوئی کمی نہ ہو۔ چنانچہ ایک افیونی نے یوں خیال ظاہر کیا۔

"آؤ ہم تم دونوں شرکت میں مٹھائی کی ایک —— شاندار دُکان کھولیں"۔

دوسرے افیونی نے کہا۔

"اے یارِ غم خوار! واقعی تیری یہ تدبیر نہایت خوب ہے لیکن اے بھائی، شہر کے بازار میں مٹھائی کی دُکان کھول کر بیٹھنا اور مٹھائی بیچنا عزّت میں بٹّہ لگنے والی بات ہوگی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کسی کھیت میں گنّے بوئے جائیں اور جب گنّے تیار ہو جائیں تو اس وقت ان کو بیچ کھائیں۔ اور کھیت ہی میں ہم تم چھریاں اور قردلیاں لے کر بیٹھیں —— پھر مثلاً ہم نے تڑاق سے ایک گنّا توڑا، چھیلا اور کھایا۔

یہ بات سُن کر پہلا افیونی بولا۔

"نہ بھائی! میں تو دو گنّے تڑاق پڑاق سے توڑوں گا اور کھاؤں گا"۔

دوسرے افیونی نے پہلے افیونی کے سر پر دھول مار کر کہا۔
"اے فساد کی گانٹھ! فتنے کی جڑ! تو ایسا کہاں کا زبردست عرش کا تارا ہے جو مجھ سے ایک گنّا تو زیادہ کھائے گا۔"
غرض کہ اتنی سی بات پر دونوں افیونیوں میں تو تو میں میں ہونے لگی اور جھگڑا اتنا بڑھا کہ معاملہ شہر کوتوال کے روبرو پیش ہوا۔ یہ حیرت انگیز ماجرا سُن کر کوتوال نے کہا۔
"نہ بھئی! ہم تمھارے اِس مقدمے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔"
کوتوال کے یہاں سے ناکام ہونے کے بعد دونوں افیونی اپنے اِس مقدمے کو فوجدار کے پاس لے کر گئے۔ فوجدار نے اُن سے پوچھا۔
"تم نے کس جگہ گنّے کا کھیت بویا تھا، جو یہ واقعہ پیش آیا۔"
وہ افیونی جس نے ایک گنّا کھانے والی بات کہی تھی، بولا۔
"حضور! اُس نے اور ہم نے یہ طے کیا تھا کہ کہیں گنّے کا کھیت بویا جائے۔ میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہیں کھیت ہی میں بیٹھ کر میں ایک گنّا توڑوں گا، چھیلوں گا اور کھاؤں گا۔ میری اِس بات کے جواب میں اس نے کہا کہ میں تو دو گنّے کھاؤں گا۔ سو حضور! میں نے اِس بات پر اُس کے ایک دھول ماری۔ اب سرکار آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ یہ مجھ سے ایسا کہاں کا بڑا ہے جو میرا شرکت دار ہو کر دو گنّے کھائے گا۔"
یہ قِصّہ سُن کر فوجدار نے جواب دیا۔
"تمھارے اِس قِصّے کو سُن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں کا حِصّہ برابر برابر ہونا چاہیے۔ لیکن تم نے جو وہ گنّے کھیت

میں بوئے ہیں پہلے اُن کا ٹیکس ادا کرو۔ اُس کے بعد ہی اُن گنّوں پر تمھارا حق ہوگا۔

غرض کہ بے چارے دونوں افیونیوں نے بن بوئے کھیت کا جُرمانہ ادا کیا اور وہاں سے دفع ہوئے۔

گھوڑا کہاں ہے؟

ایک افیونی تھا۔ اُس کا نوکر بھی افیونی تھا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ افیونی اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں جانے کے لیے سفر پر نکلا۔ نوکر بھی اُس کے ساتھ تھا۔ راستے میں وہ دونوں ایک جگہ ٹھہر گئے تاکہ نشہ پانی کرکے اور تازہ دم ہوکر پھر چلیں۔ گھوڑے کو قریب ہی میں ایک درخت سے باندھ کر کھڑا کر دیا۔ جب مالک اور نوکر دونوں نشے پانی سے فارغ ہو چکے تو چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مالک افیونی نے نوکر افیونی سے کہا۔

"دیکھ بھائی! خبردار کچھ بھولنا نہیں کیونکہ یہ مُسافری ہے۔"

مالک کی یہ بات سُن کر نوکر افیونی بولا۔

"صاحب! کچھ بھولنے کا کیا سوال ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے، آپ کے پاس افیون کا ڈبّہ ہے اور میرے پاس حُقّہ اور کوئلوں کی تھیلی، ظاہر میں تو کوئی چیز بھولے نہیں، باطن کی خدا جانے شعر

کچھ ابھی ایسا نشہ بھی تو نہیں

بھُول جائیں چیز کو جو ہر کہیں "

غرض یہ کہ وہ دونوں اپنی منزل کی طرف چل نکلے۔ چند قدم چلنے کے

بعد مالک افیونی نے نوکر افیونی سے پھر پوچھا۔
"کیوں بھائی! کچھ بھولے تو نہیں۔ دیکھ مجھے کچھ شک ہو رہا ہے اب بھی موقع ہے، رُک کر دیکھ لے اور اطمینان کر لے۔"
نوکر نے پھر جواب دیا۔
"صاحب! آپ کو تو خواہ مخواہ کچھ وہم ہو گیا ہے۔ میرا سامان میرے پاس ہے اور آپ کا سامان آپ کے پاس۔ پھر کچھ بھولنے کا کیا سوال ہے۔"
اس بات چیت کے بعد دونوں پھر چل کھڑے ہوئے اور آخر کار ایک شہر کی سرائے میں پہنچ گئے۔ سرائے کی دُلاری نامی بھٹیاری سے بولے۔
"اے بھٹیاری! جلدی سے کھانے دانے اور گھاس کا بندوبست کر دے کیونکہ ہم لوگ افیونی ہیں۔ ہم کو بھوک اور پیاس کی برداشت نہیں۔"
بھٹیاری نے فرمائش سُن کر دانا اور گھاس منگوایا اور کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بھٹیاری کو خیال آیا کہ میاں صاحب نے دانا گھاس تو منگوا لیا پر اُن کا گھوڑا تو کہیں نظر نہیں آیا۔ اُن کے ساتھ تو آیا نہیں، شاید تھکن کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ اسی وجہ سے اب تک یہاں نہیں پہنچا۔ ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔ تب بھٹیاری نے نوکر افیونی سے پوچھا۔
"اے عزیز باتمیز! دانہ گھاس میرے پاس تیار رکھا ہے اور تیرا گھوڑا ابھی تک نہیں آیا۔ اس کا کیا مطلب! کیا کچھ لوگ پیچھے رہ گئے ہیں یا گھوڑا ہی تھکن کی وجہ سے میاں کی سواری کے قابل نہ تھا؟"

نوکر افیونی نے جو یہ وحشت اثر بات سنی تو اُس کے تو ہوش اُڑ گئے اور دل میں کہا "واقعی" میاں سچ کہہ رہے تھے کہ کچھ بھولے تو نہیں۔ معلوم ہوا کہ شاید گھوڑا ہی بھول گئے"۔ آخرکار نوکر افیونی بھاگا بھاگا اپنے مالک کے پاس آیا اور بولا۔

"میاں غضب ہو گیا! بھٹیاری پوچھ رہی ہے کہ تمہارا گھوڑا کہاں ہے؟ دانہ گھاس خراب ہو رہا ہے"۔

نوکر افیونی کی یہ بات سُن کر مالک افیونی نے غصّے ہو کر کہا۔

"کیوں بے گدھے! میں نہ کہتا تھا کہ کچھ بھولے ہیں۔ آخر کو میرا کہا سچ ہوا"۔

ہاں میاں! آپ نے سچ ہی کہا تھا"۔ نوکر نے مُنہ لٹکا کے جواب دیا۔

غرض وہ دونوں اُلٹے پاؤں، ہلتے جُلتے گھوڑے کی تلاش میں دوڑ پڑے۔

دودھ کا گاہک

ایک افیونی نشے کی حالت میں ایک اہیر کے گھر رات کے وقت ڈودھ لینے گیا۔ اہیر کی بیوی نے اُس سے کہا۔

"میاں صاحب! اِس وقت اگر تمھیں تھن تلے کا بالکل خالص دُودھ چاہیے تو تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میں تم کو اچھے سے اچھا بے پانی دُودھ دوں گی"۔

اہیرن کی یہ بات سُن کر میاں افیونی، بے پانی دُودھ کے انتظار میں، ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ کھڑے کھڑے افیون کے نشے نے جو زور پکڑا تو وہ اپنی جگہ ایسے جمے کہ اگر سر کی پگڑی کوئی اُچکا اُچک لے جائے تو بھی میاں جی کو خبر نہ ہو۔ اہیرن کو ان کا خیال نہ رہا۔ رات کا اندھیرا بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے کام کاج سے فُرصت پاکر اپنے گھر کی ٹٹی بند کر کے آرام سے سو گئی۔ اور میاں افیونی جُوں کے توں وہیں جمے کھڑے رہے۔

اب اتّفاق ایسا ہوا کہ رات میں کسی وقت بوجھ سے لدا ایک چھکڑا اُس راستے سے گزرا۔ گاڑی بان اندھیرے کی وجہ سے ہر آن "پوئش پوئش" کرتا جا رہا تھا۔ حالتِ نشہ ہی میں یہ آواز جو میاں افیونی کے کان میں پڑی تو وہ ذرا سے سَرک کر اہیر کے دروازے کی ٹٹی سے

ٹک کر کھڑے ہوگئے۔ وہ چھکڑا تو وہاں سے گزر گیا لیکن افیونی کو ایسا نشہ
چڑھا کر ساری رات ٹٹی سے لگے کھڑے رہے یہاں تک کر صبح ہوگئی۔
صبح تڑکے ہی اہیرنی اٹھی۔ اور بھینسوں کے دانے پانی میں لگ گئی۔
میاں افیونی کے کان میں جو بالٹی سے پانی انڈیلنے کی آواز آئی تو وہ نشے
سے چونک کر بے اختیار بول پڑے۔

"ارے او کم بخت! میرے دودھ میں پانی نہ ملانا، نہیں تو جوتیاں
مار مار کے تیرا سر گنجا کر ڈالوں گا۔"

اتنی صبح صبح یہ واہیات بات سن کر اہیرنی نے جو ٹٹی کھولی، تو میاں
افیونی دھڑام سے گر پڑے۔ اور جھنجھلا کر بولے۔

"ابے او اندھے چھکڑے والے! میں اس قدر الگ بچ کر کھڑا تھا،
لیکن تو نے یہاں بھی مجھ کو دھکا دے کر گرا دیا۔ اشعار

خدا تیرے چھکڑے کو غارت کرے
اگاڑی کا یا بیل تیرا مرے
کہ جس سے ترے باپ دادا کی لیک
مٹے اور تو در بہ در مانگے بھیک۔"

میاں افیونی کی یہ عجیب و غریب بات سن کر اہیرنی بولی۔
"اے عزیز با تمیز! تو شام سے اب تک یہیں کھڑا تھا؟" رحمت خدا
کی!" شعر

جو افیون ایسی ہی تو کھائے گا
تو اک روز پینک میں مر جائے گا۔"

چھٹا باب
کنجوسوں کی کہانیاں

کرامت والی کشتی

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ایک کنجوس، جو بڑا سُست و کاہل اور تباہ حال تھا، اپنے گھر سے کہیں چلا گیا تھا، اور اُس کی نیک سیرت بیوی چرخا کات کات کر بسر اوقات کرتی تھی۔ خُدا کی قدرت سے یہ ہوا کہ ایک دن اُس کے یہاں ایک روشن ضمیر اور خوش تقریر فقیر آیا اور کچھ سوال کیا۔ اُس نیک طینت عورت نے فوراً وہ سارا آٹا اُٹھا کر فقیر کو دے دیا جو اُس نے اپنی روٹی پکانے کے لیے رکھا تھا۔ فقیر نے جو عورت کی یہ نیکی دیکھی تو اُس سے پُوچھا۔

"اے نیک بی بی! تیرا دُنیوی کام کاج کیوں کر چلتا ہے؟"

اِس روشن ضمیر اور کرامات والے فقیر کی یہ بات سُن کر اُس بے چاری نے جواب دیا۔

"اے حضرت سلامت! میرا شوہر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اب میں صُبح و شام چرخا کات کے زندگی کے دِن کاٹ رہی ہوں شعر

اور کیا تم سے میں کہوں حضرت
تم پہ روشن ہے سب مری حالت

فقیر نے جب عورت کی یہ بپتا سُنی تو اُس نے اپنی جھولی سے ایک

بے مثال کشتی نکال کر عورت کو دی اور کہا۔
"اے افلاس زدہ بی بی! جس وقت تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو ضروری اخراجات کے لیے روپوں پیسوں کی حاجت ہو تو اُس وقت تو اس کشتی کو پاک صاف زمین پر رکھنا اور یہ دُعا مانگنا کہ 'اے پروردگارِ عالم اور اے دونوں جہان کے مالک' حضرت خواجہ خضر علیہ السلام کے صدقے میں مجھ کو ایک ہزار روپے خزانۂ غیب سے عنایت کر دے! تب اے نیک بی بی! اس قیمتی اور پُر کرامات کشتی کے خواص سے تجھ کو ایک ہزار روپے ملیں گے اور تیرے پڑوسیوں کو دو ہزار روپے حاصل ہوں گے۔"
یہ خوش خبری سُن کر وہ نیک بی بی بولی۔
"اِس سے اچھی کیا بات ہو گی کہ میرے ساتھ محلّے والے بھی رنج و غم اور افلاس سے چھٹکارا پائیں گے اور مجھ پر رشک کرنے اور مجھ سے جلنے والا کوئی نہ ہو گا۔
غرض کہ اُس روشن ضمیر فقیر نے وہ کشتی اُس عورت کو دی اور اپنی راہ پکڑی۔ اُس کے جانے کے بعد عورت نے اپنے گھر کی زمین لیپ لاپ کر پاک صاف کی۔ بڑے اہتمام سے وہ کرامات والی کشتی زمین پر اپنے سامنے رکھی اور نہایت دِل لگا کر اللہ میاں سے یہ دُعا مانگی۔
"اے خالقِ اکبر! حضرت خواجہ خضر کے اِس صدقے میں مجھ پریشان حال اور غریب کو ایک ہزار روپے خزانۂ غیب سے عنایت کر دے۔"
اللہ تعالیٰ نے اُس کی دُعا قبول کی۔ اُسے ایک ہزار روپے ملے اور سب محلّے والوں کو دو دو ہزار روپے حاصل ہوئے۔ رفتہ رفتہ اِس

غیر متوقع اور خزانۂ غیب سے ملنے والی دولت کے بدولت سب بُلنے والے بہت مال دار ہوگئے اور سب نے نہایت عالی شان اور پختہ مکانات بنوالیے۔ اُس عورت نے بھی اپنے لیے نہایت عُمدہ اور خوبصورت مکان بنوالیا۔

کچھ عرصے بعد اُس عورت کا شوہر، پریشان حال، تباہی کا مارا، آوارہ گردی کرتا بھٹکتا بھٹکاتا جو اپنے گھر کی طرف واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا سارا محلّہ جگ مگا رہا ہے۔ اُس نے جب یہ عالم دیکھا تو ایک شخص سے پُوچھا۔

"اے بھائی! فلاں شخص کا ویران مکان کہاں ہے؟"

آخر کار جب وہ پتہ پُوچھ کر اپنے عالی شان مکان کے پاس آیا اور اپنے پُرانے بے نشان مکان کی کچھ نشانی دیکھ بھال کر گھر کے اندر جانے لگا تو ایک چوکی دار نے اُسے روکا اور کہا۔

"ابے او کنگال! کہاں جاتا ہے؟ اگر تو بھیک مانگنے آیا ہے تو باہر سے سوال کر، یہاں کے سخی ہاتھوں سے تیری تمنّا کی جھولی بھر جائے گی۔"

چوکی دار کی یہ بات سُن کر کنجوس تڑخ کر بولا۔

"اے مردود! میں اِس گھر کا مالک ہوں۔"

یہ احوال جب اُس کی نیک سیرت بی بی نے سُنا تو چقیں پردے چھڑوا کر اُسے مکان عالی شان میں بلوایا۔ اُس کے اُٹھنے بیٹھنے کے طور طریق سے اُسے پہچانا کہ یہ واقعیٔ اُس کا شوہر ہے۔ تب اُس نیک بی بی نے اُسے غسل دِلوایا اور نفیس نفیس اور صاف ستھرے کپڑے پہنوائے۔ لیکن وہ کنجوس تھا بڑا ذلیل۔ اپنے دِل میں کہنے لگا۔

"خُداوندا! یہ خواب ہے یا بیداری! کبھی ایسا دیکھنے کا اِتّفاق اِس دُنیا میں نہ ہوا تھا۔"

جب اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو آخرکار اپنی بیوی سے پُوچھا۔

"اے بی بی! خدا کے واسطے سچ سچ بتا کر سب محلّے والوں کے یہ عالی شان مکان تیری عمارت سے دوگنے اُونچے کیوں ہیں۔ اور اے نیک بخت! یہ دولت اور یہ شان و شوکت تجھ کو کہاں سے ہاتھ آئی؟"

بے چاری اُس بھولی بھالی اور خدا ترس عورت نے سارا واقعہ شروع سے آخر تک اُس حاسد اور تنگ دِل کنجوس کو بتا دیا۔

کشتی اور اُس کی ایسی عجیب و غریب کرامت کا حال سن کر کنجوس مکھی چُوس نے اپنی نیک صفت بیوی کے زور سے ایک دو ہتھڑ مارا اور چیخ کر بولا۔

"اے کم بخت! روسیاہ! تیرے لیے یہی بہتر تھا کہ تو زندگی بھر چرخا کات کات کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتی پر محلّے والوں کو اِس قدر مالامال نہ کرتی۔ خیر! اب جو ہوا، سو ہوا، لیکن وہ کشتی اب تو میرے پاس لے کر آ، میں بھی تو دیکھوں وہ کیسی پُر کرامت ہے۔ وہ کشتی ہے یا دولت کی جڑ!"

غرض کہ کنجوس مکھی چوس نے وہ کراماتی کشتی اپنی بیوی سے ہتھیا لی اور پاک صاف زمین پر اُسے رکھ کر بولا۔

"اے خالقِ اکبر! حضرت خواجہ خضر کے صدقے میں میرے دو مکان چھت اور سائبان سمیت ڈھے جائیں!"

اس بددُعا کا مُنہ سے نکلنا تھا کہ اُس کنجوس کے دو مکان ویران ہو

گئے اور محلّے والوں کے چار چار مکان بے نشان ہو گئے۔ دوسرے روز اُس نے کشتی کو پھر اپنے سامنے رکھا اور یہ بددُعا دی۔

"اے ذاتِ باری! حضرت خواجہ خضر کے صدقے میں میرے گھر کے آس پاس پچاس کنویں ہو جائیں"۔ سو یہ ہوا کہ اُس کے گھر کے آس پاس تو پچاس کنویں کھُد گئے جبکہ محلّے والوں کے گھروں کے اِردگِرد سو سو کنویں کھُد گئے۔ تیسرے روز اس بدبخت نے یہ دُعا مانگی۔

"اے جن و بشر کے بنانے والے! حضرت خواجہ خضر کے صدقے میں میری ایک آنکھ اور ایک کان جھڑ جائے"۔ اس کے نتیجے میں کنجوس خود تو کانا اور ایک کان سے بوچا ہو گیا لیکن سارے محلّے والے بالکل اندھے اور دونوں کانوں سے بوچے ہو گئے۔ جب سارے محلّے والوں پر اچانک اِس طرح کی مُصیبتیں اور بلائیں نازل ہونے لگیں تو وہ زچ ہو گئے اور آپس میں مل کر کہنے لگے۔

"یارو! یہ تو بڑا غضب ہے کہ اُس ملعون کا تو صرف ایک ہی نقصان ہوتا ہے اور ہم سب کے ہر وقت دو بڑے نقصان ہوتے ہیں"۔

غرض کہ سارے محلّے والے آپس میں صلح مشورہ کر کے اُس ذلیل اور حاسد کنجوس کے پاس آئے اور اُس سے بولے۔

"اے عزیز باتمیز! تو اس ناشائستہ حرکت سے باز آجا، کیونکہ ناحق ہم لوگوں کا نقصان ہو رہا ہے"۔

محلّے والوں کی یہ بات سُن کر کنجوس نے جواب دیا۔

"بھائیو! یہ کیا غضب ہے کہ مجھ کو تو صرف ایک ... ہزار روپے ہی

ملیں اور تم کو دو ہزار روپے حاصل ہوں شعر

ہائے اِس رشک سے نہ کیوں کر آہ
حال مجھ خستہ حال کا ہو تباہ"

کنجوس کی زبانی یہ حاسدانہ بات سُن کر سب محلّے والوں نے کہا۔

"اے عزیز ناچیز! اچھّا ایک کام کر۔ ہم لوگوں کے پاس جو دولت تجھ سے دوگنی بلکہ تگنی ہے، وہ سب تو ہم سے بہ خوشی لے لے اور اس کشتی کو حضرت خواجہ خضر کے نام پر دریا میں چھوڑ دے"۔

غرض کر اُس ذلیل اور جنونی کنجوس نے روپوں پیسوں کے لالچ اور اُس سے دوگنا مال حاصل کرنے والے لوگوں کے رشک سے اُس بے مثال اور پُر کرامت کشتی کو دریا میں بہا دیا۔

حضرتِ رمضان

ایک کنجوس کے گھر قسمت کا مارا ایک موسیقار آیا۔ بے چارے موسیقار نے گھنٹوں اپنی بے مثل موسیقی سے کنجوس کا دِل بہلایا، مگر کنجوس نے ایک پیسہ بھی موسیقار کو انعام میں نہ دیا۔ جب وقت محفل برخواست ہوئی تو کنجوس نے اپنے خان ساماں سے کہا۔

"میاں اِس مہمان کو کچھ کھانا وانا کھلا پلا دینا۔"

خان ساماں کو یہ حُکم دے کر کنجوس تو اپنی خواب گاہ میں جا کر سو گیا، اُدھر بے چارہ موسیقار بے دھڑک خان ساماں کے پاس گیا اور اُس سے کہا۔

"بھائی! مارے بھُوک کے تو میرا دم نکلا جا رہا ہے۔ خُدارا جلدی مجھے کچھ کھانے کو دو تاکہ میرا دم میں دم آئے۔"

خان ساماں نے موسیقار کی یہ معصومانہ بات سُن کر جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے تو اِس گھر میں کوئی انجان مہمان آیا ہے۔ ایسی ہی بھُوک لگی ہے تو ذرا سا غم کھالے۔ اِس گھر کے کھانے پینے کی ریت کا راز تجھ پر خود بہ خود کھُل جائے گا۔"

خان ساماں کی یہ دِل شکن بات سُن کر موسیقار بے چارہ کُڑ مُڑا کر

چُپ ہوگیا۔ آخر کرتا بھی کیا۔ ناچار بُھوکا پیاسا، مایوس ہوکر دیوان خانے کے ایک کونے میں سر مُنہ پیٹ لپاٹ کر سو گیا۔

اور جب صبح ہوئی تو کنجوس اپنی خواب گاہ سے برآمد ہوا اور موسیقار سے بولا۔

"رات کو خان ساماں نے تیری کیسی خاطر مدارات کی؟"

موسیقار بے چارہ بھوک پیاس سے بے تاب ہو رہا تھا۔ کنجوس کی یہ بات سُن کر اُسے غُصّہ تو بہت آیا پر مروّت کی وجہ سے کچھ سخت سُست کہنے کے بجائے نہایت نرمی سے بولا۔

"خداوندِ نعمت! رات کی خاطر مدارات کے کیا کہنے۔ سُبحان اللہ! اب تک مسرور مدہوش ہوں۔ رات آپ کے مکان پر ایک ایسی زیارت میسّر آئی کہ جس کا بیان، بیان سے باہر ہے۔"

کنجوس نے مُسکرا کر پوچھا۔

"اچھا! بھائی مجھے جلدی بتا کہ تجھے یہاں کیسی زیارت حاصل ہوئی؟"

موسیقار نے کنجوس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"قربان جاؤں! آپ کی عنایات اور مہربانیوں سے سیر ہوکر یہ غُلام دیوان خانے میں سو رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے اِس عالی شان مکان کے صحن میں ایک سبز پوش بزرگ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ غُلام اُن کے روبرو حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر اُن سے پُوچھا۔

"اے حضرت سلامت! آپ کون بُزرگ ہیں؟ جو اِس جگہ تشریف لائے۔"

میرا یہ سوال سُن کر حضرت نے جواب دیا۔

"اے عزیزِ باتمیز! میں حضرتِ رمضان المبارک ہوں۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ دُنیا کے تمام عام و خاص لوگوں کے گھروں میں رہتا ہوں اور گیارہ مہینے اِس ویران مکان میں میرا قیام رہتا ہے" حضرت کا یہ کلام سُن کر میں چاہتا تھا کہ اُن کے مُبارک قدموں پر اپنا سر رکھ کر کچھ اپنی حالتِ پُرملامت کا ذِکر کروں، مگر اُسی وقت بدقسمتی سے اچانک میری آنکھ کُھل گئی اُس کے بعد پھر وہ مجھے نظر نہ آئے۔ مگر اُن کی زیارت سے وہ سرور آیا کہ بھوک پیاس کی شِدّت بھی بھُول گیا۔"

موسیقار کی یہ بات سُن کر وہ کنجوس اپنے دِل میں بہت شرمندہ ہوا۔

کبھی مشرق، کبھی مغرب

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ کسی کنجوس مکھّی چُوس کے گھر ایک موسیقار بہ طور مہمان آیا۔ گانے بجانے کی خوب خوب محفل جمی۔ جب گانا بجانا ختم ہو گیا تو کنجوس مکھّی چوس اپنے پلنگ پر لمبی تان کر سو گیا۔ بے چارہ موسیقار انعام واکرام کی امّید میں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ سب خدمت گار سو گئے اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو کھانا کھانے کے لیے چلے گئے۔ موسیقار تنہا بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے تو اُس کی نظر ایک کونے میں پڑی جہاں ایک خوان میں کچھ مٹھائی سجی سجائی رکھی تھی۔ موسیقار نے یہ موقع غنیمت جانا اور لپک کر خوان کی مِٹھائی کھانے لگا۔ جب خوب سیر ہو گیا تو چُپکے سے ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔

جب صبح ہوئی تو کنجوس مکھّی چُوس نیند سے بیدار ہوا۔ ہاتھ مُنہ دھو دھا کر دیوان خانے میں آیا۔ اُسے دیکھ کر موسیقار اُس کے قریب آیا اور دوزانو بیٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حضور! آپ تو محفل کے بعد آرام سے جا کر سو گئے۔ یہ بندہ بھی گرمی کی شدّت سے یہیں سو گیا تھا"

کنجوس نے جواب دیا۔

"اے عزیز باتمیز! تو نے بہت اچھا کیا۔ لے ایک بات سُن! آج رات میں نے ایک بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوں اور کبھی مشرق کی طرف نکل جاتا ہوں اور کبھی مغرب کی طرف! ابھی مشرق میں ہوں تو ایک سیکنڈ بعد مغرب میں"۔
کنجوس کے اِس خواب کا حال سُن کر موسیقار بولا۔
"خداوند نعمت! یہ غُلام ناکام بھی رات کو ایک بڑی عجیب و غریب مُصیبت میں پڑ گیا تھا۔ ایسی مُصیبت کہ بس کیا بیان کروں شعر

درد دِل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چُپ بھی رہا نہیں جاتا

حضور! یہ آپ کا غُلام اِس مکان میں رات نہایت اطمینان اور آرام سے سو رہا تھا کہ یکایک دیکھتا ہے کہ دو آدمی نہایت ڈراونی صورت کے، بالکل دیووں کی طرح، آئے اور بندے کو دبوچ کر کہنے لگے
"اے جوان! اس خوان کی ساری مٹھائی کھا جا، نہیں تو تھپڑ مار مار کے تجھے موت کا مزہ چکھا دیں گے"۔
حضور! اِس غُلام ناکام نے بہت انکار کیا۔ بہتیرے بہانے بنائے، لیکن اُنھوں نے ایک نہ سُنی، اور خوب جُوتے مار مار کے مجھے وہ مٹھائی کھلوائی۔
موسیقار کی یہ دل شکن بات سُن کر کنجوس مکھی چُوس کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ گھبرا کر جھٹ سے بولا۔
"ہیں! اے بدذات! تو نے اُس وقت مجھ کو کیوں نہ جگا دیا؟ میں اُن دونوں کم بختوں سے نپٹ لیتا۔ ہائے میری مٹھائی"۔

موسیقار نے کنجوس کی بات سُن کر جواب دیا۔

"واہ حضور واہ! آپ بھی کیا بات کرتے ہیں! آپ اُس وقت بھلا مجھ غریب کے ہاتھ کہاں آتے؟ جو آپ سے سارا حال کہتا۔ اُس وقت تو آپ کبھی مشرق میں رونق افزا ہو رہے تھے اور کبھی مغرب کو تشریف لے جا رہے تھے۔ اِتنی دُور آپ تک کیسے پہنچتا۔"

موسیقار کا یہ جواب سُن کر کنجوس مکھی چُوس بہت شرمندہ ہوا۔

دو کنجوسوں کی مُلاقات

کسی شہر میں ایک نامی گرامی کنجوس رہتا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنے کھانے پینے پر روزانہ ایک پیسہ خرچ کیا کرتا تھا۔ اُس کی کنجوسی کے چرچے جب کسی دوسرے شہر کے مشہور کنجوس نے سُنے تو اُس نے سوچا کہ چل کر اُس سے ملنا چاہیے اور اُس کی کنجوسی کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ سو دوسرے شہر کا کنجوس بڑی مُصیبتیں جھیلتا ہوا پہلے شہر والے کنجوس کے پاس آیا اور گزر اوقات کا حال پُوچھا۔ دوسرے شہر کے کنجوس کے جواب میں وہ بولا۔

"اے عزیز باتمیز! سچ بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بُزرگوں کی چھوڑی ہوئی اِس قدر دولت مجھے دی ہے کہ اگر میں ہزار برس بیٹھ کر بھی اُس کو کھاؤں تو بھی کم نہ ہو۔ پر بھائی میں کوئی فضول خرچ تو ہوں نہیں، اِس لیے میں نے اپنی زندگی بسر کرنے کا یہ ڈھنگ اپنا رکھا ہے کہ روز ایک پیسے سے زیادہ خرچ نہ ہو۔ اِس ایک پیسے میں پون پیسے کا آٹا خرید تا ہوں، ایک ادھی (پائی) روٹی کی پکوائی میں دیتا ہوں اور ایک ادھی کا شوربا یا گُڑ خرید لیتا ہوں، تب خوب مزے سے اچھی طرح سیر ہو کر کھانا کھاتا ہوں اور بڑے آرام سے سو جاتا ہوں۔"

پہلے کنجوس کے اخراجات کی یہ تفصیل سُن کر دوسرا کنجوس جھلّا کر بولا۔
"اے تو تو نہایت فضول خرچ ہے۔ ہر روز تو ایک پیسہ کھاتا ہے۔ ایسا فضول خرچ شخص تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔"
دوسرے کنجوس کی یہ دل شکن بات سُن کر پہلے کنجوس کو بڑا دھکّا لگا کیونکہ وہ اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑا نامی گرامی اور تیس مار خاں کنجوس سمجھتا تھا۔ خیر اُس نے جھجکتے جھجکتے دوسرے کنجوس سے پُوچھا۔
"اے یارِ غم خوار! تو اپنا حال بیان کر کہ تو کس طرح بسر اوقات کرتاہے۔"
دوسرے کنجوس نے جواب دیا۔
"بھائی اپنا تو یہ چلن ہے کہ ایک پیسہ اور ایک رومال لے کر ہر روز صبح کو گھر سے نکلتا ہوں اور بنیے کی دُکان پر جاکر اُس پیسے کا آٹا لے کر رومال میں باندھ لیتا ہوں تھوڑی دُور جاکر پھر اُس بنیے کی دُکان پر واپس آتا ہوں اور کچھ بہانہ بناکر آٹا واپس کر کے اُس سے اپنا پیسہ لے لیتا ہوں، اور کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر رومال میں لگا ہوا آٹا ایک رکابی میں جھٹک لیتا ہوں۔ اُس کے بعد دوسرے بنیے کی دُکان پر جاتا ہوں اور اسی طرح اس سے بھی آٹا لے کر واپس کر دیتا ہوں، اور رومال میں لگا ہوا آٹا پھر رکابی میں جھٹک لیتا ہوں۔ دوپہر تک میں یہی عمل کرتا ہوں۔ کئی دُکانوں سے آٹا خریدنا، واپس کرنا اور رومال سے رکابی میں جھٹک لینا۔ غرض یہ کہ میری رکابی میں میرے کھانے کے لائق مِقدار میں آٹا جمع ہو جاتاہے۔ تب میں کسی بنیے سے بے دھڑک ذرا سا نمک مُفت مانگ لیتا ہوں۔ اور دریا کے کنارے چلا جاتا ہوں۔ آٹا خریدنے اور واپس کرنے کے دوران ہی راہ باٹ کی لکڑی اور

چھپٹیاں چُن چُن کر جمع کرتا جاتا ہوں۔

دُریا کے کِنارے بیٹھ کر دریا ہی کے پانی سے آٹا گوندھ کر، لکڑیوں کی آنچ میں موٹی جھوٹی روٹی پکاتا ہوں پھر روٹی بغل میں داب کر شہر کا رُخ کرتا ہوں اور گلی گلی کوچے کوچے گھومتا پھرتا ہوں، اور جس وقت کسی گھر سے دال بگھارنے یا گوشت بھُوننے کی بو باس میری ناک میں آتی ہے، تب وہیں بیٹھ کر مزے سے کھانا کھا لیتا ہوں۔ سو بھائی اپنی زندگی تو اس طرح سے گزرتی ہے۔ مگر بھائی! تو بڑا فضول خرچ ہے"۔

دوسرے کنجوس کی یہ کہانی سُن کر پہلے کنجوس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "سچ ہے بھائی! تو بڑا دُنیا دار ہے۔ تجھ سا دُنیا دار میں نے کوئی نہیں دیکھا"

مہمان نوازی

ایک کنجوس عورت تھی۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی ایک رشتے دار
عورت کو اپنے گھر مہمان بُلایا۔ دو چار گھڑی کے بعد اُس نے کہا۔
"اے بی بی! اگر تو کچھ کھانا وانا کھائے تو تیرے واسطے پکوالوں، مجھے
تو ابھی بھُوک نہیں ہے۔"
دوسری عورت بے چاری سیدھی سادی تھی، اور پھر یہ کہ مہمان تھی،
اس لیے مروتاً اُس نے جواب دیا۔
"اے بی بی! ابھی کیا جلدی ہے، جو کچھ گھر میں پکے گا میں بھی وہی
کھا لوں گی۔"
یہ سُن کر وہ میزبان کنجوس عورت چُپ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد پھر بولی۔
"اے بی بی! اب تو دوپہر ہونے کو آئی! تو کہے تو اب تیرے واسطے
گوشت وغیرہ منگوا کے پکوالوں۔"
مہمان عورت نے جواب دیا۔
"ہاں! کوئی حرج نہیں۔"
میزبان کنجوس عورت نے اُس کے جواب میں کہا۔
"ارے تو کچھ کھائے گی نہ پیئے گی۔ ناحق میرا پکا پکایا کھانا خراب ہو

جائے گا۔"

یہ کہہ کر میزبان کنجوس عورت پھر اِدھر اُدھر کی اَناپ شناپ باتیں کرنے لگی۔ یہاں تک کہ شام کا وقت بھی ڈھلنے لگا اور رات ہونے کو آئی۔ اُس نے پھر پُوچھا۔

"اے بی بی! اب بھی کچھ نہیں گیا، مگر اِس وقت گوشت تو ملے گا نہیں، اگر تو کہے تو تیرے واسطے کچھ کھچڑی ہی پکا لوں۔"

مہمان عورت نے پھر جواب دیا۔

"ہاں! کوئی حرج نہیں۔"

یہ سُن کر وہ کنجوس پھر بول اُٹھی۔

"بی بی! تو کچھ کھائے گی نہ پیے گی، یوں ہی بے دِلی سے کہہ رہی ہے، ناحق میرا کھانا خراب جائے گا۔"

غرض یہ کہ اِس کنجوس مکھّی چُوس عورت نے بے چاری آفت کی ماری مہمان عورت کو پورے دو دِن تک اِسی طرح کے سوال جواب میں اُلجھائے رکھا مگر کھانا ذرا سا بھی نہ پکوایا۔ تیسرے دن اُس بھُوکی پیاسی مہمان عورت سے پھر اُس نے پُوچھا۔

"اے بی بی! آج تین دِن ہو گئے ہیں کہ تو نے پان اور پانی کے سوا کچھ کھایا پیا نہیں۔ اگر آج تو کہے تو تیرے لیے روکھی روٹی گھی شکر سے چپڑی ہوئی تیار کر دوں بھلا اُسی کو ذرا مُنہ میں ڈال لینا۔ اب ایسی بھی کیا غیریت ہے بی بی۔"

یہ پُر فطرت بات سُن کر اب تو مہمان عورت کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا اور وہ مروّت چھوڑ چھاڑ تڑخ کر بولی۔

"اے ناپاک! مکّار! نہ پکاتی ہے، نہ کھلاتی ہے، ناحق بات کیوں بنائے جا رہی ہے۔ اری تو تو ایسی بے درد کنجوس عورت ہے کہ اپنے بچّے کو بھی ہمیشہ دُودھ سے محروم رکھے"۔

مہمان عورت کی یہ جلی کٹی بات سُن کر وہ کنجوس بولی۔

"اے بی بی! تو بھی اپنا پرایا کتنا سمجھتی ہے؟ تو نے کب کہا؟ اور کب مجھ کم بخت نے تیرے واسطے کھانا نہ پکوایا؟"۔

اُس کی یہ لن ترانی سُن کر مہمان عورت نے جواب دیا۔

"اے کم بخت! کہیں بھی تو نے سُنا یا دیکھا ہے کہ انسان یا حیوان کھانا کھائے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟ کیا تجھ کو خود نہیں سُوجھتا تھا۔ کیا تو آنکھوں سے اندھی ہے۔ اور پھر جب تو نے کھانا پکوانے کو کہا، تو میں نے کہا تھا کہ "ہاں کوئی حرج نہیں"۔ تو اس پر تو بول اُٹھتی تھی کہ "نہ کچھ کھائے گی، نہ پیئے گی، یوں ہی بے دلی سے کہہ رہی ہے"۔

مہمان عورت کی بات کے آخری فقرے کو پکڑتے ہوئے وہ چالاک کنجوس عورت فوراً بولی۔

"اے بی بی! میں نگوڑی تو یہ نہ جانتی تھی تو سچ مچ کہہ رہی ہے، لیکن خیر اب میں تیرے لیے نہایت معقول اور عُمدہ کھانا پکواتی ہوں۔ دیکھوں تو کہاں تک کھاتی ہے"۔

یہ بے ہودہ بات سُن کر مہمان عورت بولی۔

"نہیں! اب مجھے کھانے کی کوئی حاجت نہیں۔ طے کا روزہ طے ہو چُکا، اب میں اپنے گھر جا کر افطار کر لوں گی"۔

یہ بات سُن کر کنجوس نے جواب دیا۔

"خیر بی بی! جس طرح تیرا جی چاہے، وہی کر۔ کیونکہ تو نہایت تُنک مزاج ہے، مجھ کو تیری خفگی اور ناراضگی منظور نہیں۔ لیکن خدا کے واسطے پھر کبھی ضرور یہاں آنا کیونکہ جیسی میں چاہتی تھی، ویسی تیری خدمت اور خاطر مدارات نہ کر سکی"۔

مہمان عورت نے کنجوسن کی یہ بے ہودہ بات سُن کر تلخی سے کہا۔

"تیرے گھر میں جو کوئی مہمان آئے تو کھانے کی بجائے وہ غم کھائے"۔

القصہ وہ مہمان عورت اس کنجوس عورت کے یہاں سے خفا ہو کر بھوکی پیاسی ہی اپنے گھر لوٹی اور پھر کبھی اپنے اور بے گانوں میں مہمان بن کر نہیں گئی۔

خالی اُنگلی

ایک کنجوس کا ایک نہایت گہرا اور عزیز دوست تھا۔ اتفاقاً کنجوس کے دوست کو کسی کام سے سفر کرنا تھا۔ بے چارہ دوست بڑی اُمیدوں کے ساتھ اپنے بخیل دوست کے پاس آیا اور بولا۔

"اے یار وفادار! تیرا یہ کنگال اور بدحال دوست کچھ ترقّی کی خاطر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور اِس وقت تجھ سے رُخصت ہونے آیا ہے۔ مگر اے میرے پیارے دوست! تو اپنی اُنگلی کی یہ سونے کی انگوٹھی مجھے بہ خوشی دے دے تاکہ میں اِس انگوٹھی کو تیری مُحبّت اور دوستی کی بے مثال نشانی سمجھ کر زندگی بھر اپنے پاس رکھوں اور جس وقت اِس کو دیکھوں، تو تجھ کو دِل سے یاد کر دوں؛ تاکہ دُور دراز کے مقام پر مجھ کو تسلّی اور تشفی ہو اور کبھی مجھے کوئی رنج وغم نہ ہو۔"

دوست کی یہ غیر متوقع فرمایش سُن کر کنجوس نے جواب دیا۔

"اے میرے پیارے اور سچّے دوست! تجھے یہ انگوٹھی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے! بس ایک کام کرنا۔ جب بھی تجھے میری شدید یاد آئے تو تو اپنی خالی اُنگلی کو دیکھنا اور کہنا کہ فلاں یارِ غم خوار سے میں نے انگوٹھی مانگی تھی، پر اُس نے نہ دی۔"

فسانۂ عجائب

مصنف

رجب علی بیگ سرور

صفحات:83

قیمت:-/16 روپے

باپو اور بچے

مصنف

پی۔ ڈی۔ ٹنڈن

صفحات:48

قیمت:-/12 روپے

مصنف

جے پرکاش بھارتی

صفحات:64

قیمت:-/14 روپے

مصنف

پی۔ ڈی۔ ٹنڈن

صفحات:-/144

قیمت:-/21 روپے

مصنف

بی۔ شیخ علی
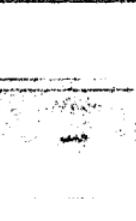
صفحات:176

قیمت:-/22 روپے

مصنف

رمیش نارائن تیواری

صفحات:94

قیمت:-/35 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
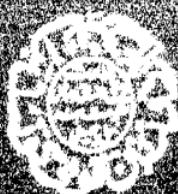
National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066